دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۸ ماہ ذی الحجہ ۱۴۳۲ھ مطابق ماہ اکتوبر ۲۰۱۱ء عدد ۴

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

لیبیا میں گذشتہ آٹھ مہینہ سے جاری خون آشام کشمکش اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ عبوری قومی کونسل کی طرف سے اعلان کیا جاچکا ہے کہ اب ملک آزاد ہے۔ پورے ملک میں جشن کا سماں ہے۔ ۴۲ سال تک ملک پر حکومت کرنے والے مطلق العنان حکمراں کرنل معمر قذافی کی بے گور و کفن نیم برہنہ لاش کئی دن تک تماشہ گاہ خلائق بنی رہی۔ اس کے بعد اسے صحراء لیبیا کی پہنائیوں میں کہیں بے نام و نشان سپرد خاک کردیا گیا۔ عرب دنیا میں سب سے زیادہ عرصہ تک حکومت کرنے والے حکمراں کا یہ انجام عبرتناک بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ ستمبر ۱۹۶۹ میں شاہ ادریس کے خلاف کامیاب فوجی بغاوت کی قیادت کرنے والا ۲۷ سالہ کرنل معمر قذافی تو صرف لیبیا ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے نوجوانوں کے ایک ہیرو کے طور پر ابھر کر سامنے آیا تھا۔ عالم اسلام کے تعلق سے اس سے بڑی توقعات وابستہ کرلی گئی تھیں۔ ہمہ گیر تاریکی میں روشنی کی ہلکی سی کرن بھی بسا غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ جب عالم اسلام کا بڑا حصہ مغرب کے سامنے سرنگوں تھا تو اس کا مغربی طاقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارنا بہت اچھا لگتا تھا۔ پھر اقتدار، اختیار اور تیل کی بے پناہ دولت کی بھول بھلیوں میں وہ کہیں راستہ بھٹک گیا اور ایک ایسے راستے پر چل پڑا جو لیبیا کے باشندوں کے لیے ایک مسلسل عذاب کی شکل اختیار کر گیا اور بالآخر ڈرینج کے ایک پائپ کے دہانے پر ختم ہوا۔ اس کا انجام دردناک بھی تھا اور عبرت انگیز بھی۔ اس کے آخری وقت کے بارے میں اب تک جو تفصیلات دستیاب ہیں ان کے مطابق اسے زندہ گرفتار کیا گیا اور پھر نہایت اذیت کے ساتھ قتل کردیا گیا، قومی عبوری کونسل اپنے پہلے امتحان میں پوری نہیں اتری۔ اس کی آخری خواہش تھی کہ اسے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے لیکن اس کی یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوئی۔

ملک، انسانیت اور اسلام کی خدمت کے غیر معمولی وسائل اسے میسر تھے۔ اس کے اندر حوصلہ بھی بہت تھا اور کام کرنے کا جذبہ بھی۔ لیکن خود پسندی، احساس ترفع، خودرائی، اپنی عظمت، اہمیت اور صلاحیت اور تاریخ میں اپنے کردار کی خودساختہ تعبیر نے اسے زمینی حقائق کے ادراک سے محروم کردیا۔ اسے اپنی سوچ پر غیر معمولی اعتماد تھا اور اس کے خلاف نقطہ نظر رکھنے والوں کو باغی اور گمراہ سمجھتا تھا اور بغیر کسی ادنی تردد کے ان کو راستہ سے ہٹا دیتا تھا۔ اپنی قوم، عالم عرب، عالم اسلام اور افریقہ کے بارے میں اس کا اپنا ایک مخصوص نقطہ نظر تھا۔ اس کی نظریاتی جڑیں جمال عبدالناصر کے عرب قوم پرستی کے فلسفہ میں پیوست تھیں۔ بعد میں عالم عرب سے مایوسی کے بعد اس کی توجہ کا مرکز افریقہ تھا جہاں اسے بادشاہوں کے بادشاہ کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس نے افریقہ کی ریاستہاے متحدہ کا خواب دیکھا تھا۔ وہ فلسطین کا حامی اور اسرائیل کا مخالف تھا اور کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کی مخالفت میں پیش پیش رہا۔ کہتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانہ میں اسے تاریخ سے دلچسپی تھی لیکن تاریخ سے سبق حاصل کرنے کے بجائے وہ تاریخ بنانے اور

تاریخ میں اپنا مقام محفوظ کرنے کے جنون میں مبتلا ہوگیا۔اپنی عظمت اور تاریخ میں اپنے مزعومہ کردار پر غیر متزلزل اذعان کے باعث وہ کئی مرتبہ مضحکہ خیز حرکتیں کرتا تھا۔اس کے لباس کے انتخاب اور بود و باش کا انداز نرالا تھا۔وہ جہاں جاتا اپنا خیمہ ساتھ لے جاتا۔اس کا ذاتی محافظ دستہ خواتین پر مشتمل تھا۔اس نے اپنے ملک کے لیے جو نظام حکومت وضع کیا تھا اس کا خمیر اشتراکیت سے اٹھایا گیا تھا چنانچہ اس نے اس کا نام الجماہیریۃ العربیۃ اللیبیۃ الشعبیۃ الاشتراکیۃ رکھا تھا۔اس نظام حکومت میں سارے اختیارات کا ارتکاز اس کے اپنے ہاتھ میں تھا۔چھوٹے کاروبار پر تو عوام کو مالکانہ حقوق حاصل تھے لیکن بڑے کاروبار مکمل طور پر حکومت کی تحویل میں تھے۔وہ اپنے آپ کو برادر قائد اور قائد انقلاب کہلانا پسند کرتا تھا۔اس کے سیاسی فلسفہ میں نہ تو اختلاف رای کی گنجائش تھی اور نہ حقوق انسانی کا کوئی مقام۔وہ اسلام پر یقین رکھتا تھا اور اپنے مخصوص انداز میں اس کی دعوت بھی دیتا تھا۔وہ اپنے طرز کا اکیلا تھا اور اسے کسی خانہ میں رکھنا مشکل ہے۔اس نے لیبیا کے باشندوں کو بہتر معیار زندگی سے ہم کنار کیا لیکن وہ یہ بھول گیا کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہتا بلکہ ایک مطمئن زندگی گذارنے کے لیے اسے بعض اور چیزوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔اس نے مغرب سے دشمنی بھی کی اور دوستی بھی۔اگر اس کی اچھائیوں اور کمیوں کا گوشوارہ تیار کیا جائے تو کمیاں زیادہ نظر آئیں گی لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مغرب نے اس کو اس کی کمیوں کی وجہ سے سزا نہیں دی بلکہ اس کا اصل سبب اس کی اچھائیاں تھیں۔اب جب کہ وہ احکم الحاکمین کی عدالت میں حاضر ہو چکا ہے تو دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی کمیوں سے درگذر فرمائے اور اس کو اپنی رحمت کے سایہ میں جگہ دے۔

کرنل قذافی کے بعد لیبیا کی صورت حال کیا رخ اختیار کرے گی اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا مشکل ہے،قومی عبوری کونسل کے صدر مصطفی عبدالجلیل نے اعلان آزادی کے ساتھ لیبیا کی تعمیر نو کے لیے جن رہنما اصولوں کی بات کی ہے وہ خوش آیند ہے۔عرب بہار سے متاثر ہونے والے دوسرے ممالک کے مقابلہ میں لیبیا میں امکانات بھی زیادہ ہیں اور مسائل بھی۔یہاں چوں کہ سارے اختیارات ایک شخص کے ہاتھ میں مرتکز تھے اس لیے اس کے ساتھ ساتھ پورا نظام حکومت بھی زمیں بوس ہوگیا۔چنانچہ نئے حکمرانوں کے لیے اس کی جگہ ایک نیا نظام وضع کرنا نسبتاً زیادہ آسان ہوگا۔لیکن دوسرے مسائل کا حل اتنا آسان نہیں،یہاں علاقائی اور قبائلی اختلافات کی نوعیت خاصی سنگین ہے۔قذافی کی سخت گیر پالیسی نے ان کو بڑی حد تک دبا رکھا تھا۔شورش کے دوران قذافی کی مخالفت اور دشمنی کا جذبہ دوسرے جذبات پر حاوی رہا۔نئی حکومت کے لیے یہ بڑا چیلنج ہوگا۔عبوری کونسل زیادہ تر ان لوگوں پر مشتمل ہے جو پہلے قذافی کے ساتھ تھے جب کہ محاذ پر لڑنے والے اکثر نظریاتی طور پر ان سے مختلف ہیں۔ابھی عوام کے ہاتھ میں بڑی مقدار میں اسلحہ موجود ہے۔اس کی واپسی کی کیا صورت ہوگی۔اگر لیبیا کے معاملات میں ناٹو کی اتنی موثر دخل اندازی نہ ہوتی تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ناٹو نے جو کچھ کیا اقوام متحدہ کے ریزولیوشن کی رو سے اس کو اس کی اجازت نہیں تھی،لیکن اپنے مفادات کی حفاظت اور توسیع کے لیے اس نے لیبیا کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا،

فطری طور پر مغربی طاقتیں نئی حکومت سے اس کی قیمت چاہیں گی۔آیندہ صورت حال بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ ان متضاد اور باہم متصادم مطالبات سے نئی حکومت کس طرح عہدہ برا ہوتی ہے۔امید کی جانی چاہیے کہ لیبیا میں ایک ایسی حکومت قائم ہو سکے گی جو عوام کی خواہشات اور آرزوؤں کی آئینہ دار ہو اور وہ اس کے زیر سایہ ایک باعزت اور مطمئن زندگی بسر کر سکیں۔

تعلیم اور سماجی خدمت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انجمن اسلام محتاج تعارف نہیں ۔ یہ انجمن ۱۸۷۴ میں بمبئی ہائی کورٹ کے پہلے مسلم جج اور انڈین نیشنل کانگریس کے تیسرے صدر بدرالدین طیب جی کی قیادت میں قائم کی گئی تھی ۔مہاراشٹرا کے علاقہ میں تعلیم کی ترویج میں اس ادارہ کی عظیم الشان خدمات سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں ۔اس کی زیر نگرانی کام کرنے والے اداروں میں ایک اعلی درجہ کا انجینئرنگ کالج ،طبیہ کالج اور درجنوں دوسرے تعلیمی ادارے شامل ہیں اور تقریباً ایک لاکھ طلبہ ان میں زیر تعلیم ہیں ۔ان تدریسی اداروں کے علاوہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور کریمی لائبریری بھی انجمن کے زیر انتظام چلنے والے اداروں میں شامل ہیں ۔اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اپنی علمی ،تحقیقی ،ادبی اور تہذیبی خدمات کے لیے علمی حلقوں میں قدر و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔کریمی لائبریری ۱۸۹۸ میں قائم کی گئی تھی ۔ یہاں منتخب کتابوں کا بڑا قیمتی ذخیرہ موجود ہے ۔ایک مدت کے بعد انجمن کے موجودہ صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی صاحب اور سکریٹری معین الحق چودھری صاحب کی دلچسپی اور معروف ادیب اور شاعر جناب شمیم طارق کی کوششوں سے اسے ایک نئی زندگی ملی ہے اور وہ ممبئی میں علمی سرگرمیوں کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی ہے ۔گذشتہ جنوری میں دارالمصنفین کا وفد ممبئی گیا تھا تو اکیڈمی کے تعارف کے سلسلہ میں پہلا پروگرام کریمی لائبریری میں ہوا تھا اور آخری پروگرام بھی اسی جگہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا۔کریمی لائبریری کی روز افزوں علمی سرگرمیوں کے ایک حصہ کے طور پر گذشتہ دنوں اس کے زیر اہتمام مہاراشٹرا کی سطح پر'مقابلہ دینیات' کا کامیاب پروگرام منعقد کیا گیا۔اس موقع پر کامیاب ہونے والے طلبہ کو نقد انعامات کے علاوہ متعلقہ اسکولوں کو شیلڈس تفویض کی گئیں ۔ یہ شیلڈس سرسید احمد خاں ،بدرالدین طیب جی ،علامہ شبلی نعمانی اور حاجی عبدالرزاق کالسیکر کے نام پر قائم کی گئی ہیں ۔عام دستور کے برخلاف جیتنے والے اسکولوں سے شیلڈس واپس نہیں لی جائیں گی ۔اس کے علاوہ تمام شرکاء کو سرٹیفکیٹ اور مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب ''مشرقی کتب خانے'' تحفہ میں پیش کی گئی ۔ پروگرام کی غیر معمولی کامیابی کے پیش نظر اگلے سال سے اسے ملک گیر پیمانے پر منعقد کرنے کا منصوبہ ہے ۔انشاءاللہ اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے ۔اس کامیاب اور مفید پروگرام کے انعقاد کے لیے ہم کریمی لائبریری کے ذمہ داروں اور کامیاب ہونے والے طلبہ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں ۔

مقالات

علامہ شبلی کی سیرت النبی ﷺ میں وارد مستشرقین کا تعارف

جناب صاحب عالم اعظمی ندوی

(۳)

۲۴- ایچ گریم (۱۰۷۵-۱۳۴۳ھ/۱۸۶۴-۱۹۲۴ء) .Grimme, H، قومیت جرمنی:

جرمنی میں تعلیم و تربیت حاصل کی، مونسٹر یونیورسٹی (Munster) میں مشرقی زبانوں کے استاذ کی حیثیت سے علمی خدمات انجام دیں۔

علمی یادگاریں: سرفہرست محمدؐ کے نام کی تحقیق، محمدؐ کے دین کے اصول، محمدؐ کے زمانہ میں عرب کی عالمی تاریخ کی اہمیت، اسلام اور یہودیت ہیں مگر شہرت سیرت محمدؐ سے ملی جو دو جلدوں میں ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی۔

سیرت محمدؐ پر جوستاف بفانموللر لکھتا ہے ''جہاں تک گریم کی کتاب سیرت محمدؐ کا تعلق ہے تو سیرت کے باب میں عربی اور یوروپی تصنیفات کے مقابلہ میں یہ ایک منفرد کوشش ہے، مصنف نے عمومی طور پر شائع شدہ ماخذوں کا سہارا لیا ہے مگر اپنے اسلاف کے طریق کار سے روگردانی بھی کی ہے، لہٰذا اپنے اسلاف کے مقابلہ میں مختلف نتائج پر پہنچا ہے۔

گریم نے احادیث کے متعلق لکھا کہ ''محمدؐ کی سیرت کے حوالے سے موجود احادیث سے

دارالعلوم کالج قاہرہ، مصر۔

بے نیازی نہیں برتی جاسکتی، تاہم جتنی زیادہ عمداً غلط بیانی اس میدان میں ہوئی ہے اتنی کسی بھی میدان میں نہیں ہوئی، دوسرے یہ کہ صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کا کوئی یقینی راستہ اب تک ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ علاوہ اس کے احادیث کا مجموعہ عمومی طور پر ایسے موضوعات پیش کرتا ہے جن کی کوئی اہمیت نہیں، اس لیے ان میں مدینہ کے زمانے کی روح تو پائی جاتی ہے مگر مکہ کے زمانے کی روح ایک دم مفقود ہے لیکن خوش قسمتی سے وہیں ایسے ماخذ موجود ہیں جو قرآن میں تاریخی حقیقت کے لیے اہمیت کے حامل ہیں''، احادیث کے علم وفن کے متعلق ان خیالات سے صاف ظاہر ہے کہ گریم کو علوم حدیث سے غالباً ابتدائی واقفیت بھی نہیں تھی ورنہ جرح وتعدیل کے عدیم المثال شعبہ علم وتحقیق کے ہوتے ہوئے وہ ایسے خیالات پیش کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔

حضورؐ کی شخصیت کے متعلق گریم کا کہنا ہے کہ ''وہ نہایت ہی ذکی، تیز طرار، اشتعال انگیز، ماہر سیاسی انسان'' تھے، یہاں استشراق کا روایتی بغض وعناد پوری طرح سامنے آجاتا ہے، جب وہ نعوذ باللہ یہاں تک کہہ جاتا ہے کہ ''جھوٹ اور فریب کا عنصر مدینہ میں زیادہ بڑھ گیا، گریم یہ دور کی کوڑی بھی لایا کہ اسلام ایک طرح کی اشتراکیت کی دعوت دیتا ہے، اسلام کی اصل کوشش یہ تھی کہ وہ ایک طرح کی اشتراکیت وضع کرے تاکہ اس وقت پورے معاشرہ میں پھیلے ہوئے گندے ماحول کو سدھارا جاسکے اس زمانے میں مکہ میں فقراء اور مال داروں کے درمیان سخت قسم کا تضاد پایا جاتا تھا، جس نے محمدؐ کو اس چیز پر ابھارا کہ وہ لوگوں سے یہ ضروری مطالبہ کریں کہ ہر شخص ضرورت مندوں کی مدد کرنے کے لیے ایک متعین ٹیکس ادا کرے، عوامی قبولیت کے لیے (محمدؐ) نے آخرت کے حساب کے عقیدے کا وسیلہ اختیار کیا''۔(۲)

۲۵- فرانٹس پیڈر ولیم میئر بوہل (۱۲۶۷-۱۳۵۱ھ/۱۸۵۰-۱۹۳۲ء) Frants Peder William Meyer Buhl، قومیت ڈنمارک:

کوپن ہیگن میں پیدائش ہوئی اور کوپن ہیگن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور بعد میں ۱۸۸۰ء سے ۱۸۹۰ء تک یہیں علمی خدمات میں مشغول رہا، ۱۸۹۸ء میں جرمنی کی یونیورسٹی لیپزگ (University of Leipizg) میں تعلیمی خدمات انجام دیں، سامی زبانوں میں عبور کی بنا پر اسے ہم عصروں میں امتیاز حاصل رہا۔(۳)

علمی یادگاریں: ۱-Messianske Forjaettelser I det Gamle Testament,1894۔
۲-Die socialen Verhaltnisse der Israeliten, 1899۔ ۳- Geographie des alten Palastina, 1896۔ ۴- Geschichte der Edomiter, 1893۔
۵-The Life Muhammeds, 1903,3. Edition dt. Translation 1961۔

موخرالذکر کتاب سیرت محمدؐ کا جرمنی ترجمہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا، جوستاف بفانمولر نے اس کے متعلق لکھا کہ ''گریم نے محمدؐ کے اردگرد کے ماحول کی تصویر کشی کی تو بوہل نے محمدؐ کی دینی ترقی کے اسباب پر بحث کی اور بڑی محنت سے عربی اور یوروپی ماخذ جمع کیے اور نقد وتمحیص کے بعد اپنی کتاب مکمل کی ہے۔ محمدؐ کی شخصیت کے بارے میں جدید مفروضات کے تعلق سے مکمل احتیاط برتی، حضورؐ کے عہد پر مفصل بحث کی اور آپؐ کی سیرت کے بیان میں اس نے افسانہ اور تاریخ میں تمیز کی اس طرح وہ گریم سے بالکل مختلف نظر آتا ہے جس کے یہاں نبیؐ کی شخصیت داخلی طور پر ہمیشہ اجنبی رہتی ہے۔(۴)

۲۶- ڈیویڈ سمیول مارگولیتھ (۱۲۷۵-۱۳۵۹ھ / ۱۸۵۸-۱۹۴۰ء) David Samuel Margoliouth، قومیت انگلستان:

لندن کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے، آکسفورڈ کے نیو کالج سے گریجویٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مشرقی زبانوں عربی، عبرانی، فارسی، ترکی، ارمینین میں مہارت حاصل کی، ۱۸۸۸ء میں Analecta Orientalia ad Poeticam Aristoteleam کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد چرچ آف لندن میں بطور پادری عملی زندگی شروع کی، پھر ۱۸۸۹ء سے ۱۹۳۷ء تک آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے علمی خدمات انجام دیں۔

علمی یادگاریں: اسلامیات پر خوب لکھا اور اسلامی تراث کی اہم کتابوں کا ترجمہ بھی کیا، درج ذیل کچھ کتابیں یہ ہیں ۱-Mohammed and the Rise of Islam,1905۔
۲- Umayyads and Abbasids,1907۔ ۳- The Early Development of Mohammedanism,1914۔ ۴-The Kitab al-Ansab of al-Sam'ani,1911۔

The Table-talk of a Mesopotamian -۶ ۔ Mohammedanism,1912 -۵
The Eclipse of the Abbasid -۷۔judge, 2 vols,1921-1922
The Schweich Relations Between Arabs and -۸ ۔ Caliphate,1922
-۹۔Israelites Prior to the Rise of Islam for 1921. 1924 Lecture
Lectures on Arabic historians, delivered before the University of
Culcutta, February 1929. Byzantine series,38. New York City: Burt
(۵)۔Franklin,1930

ان کتابوں کی وجہ سے اس کو استشراق کے میدان میں اپنے وقت کے امام کا درجہ دیا گیا، لیکن اکثر تحریریں اسلام اور شارح اسلامؐ کے حوالے سے زہر میں ڈوبی ہوئی ہیں، چونکہ نگارشات میں اس کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے جس سے نہ صرف مستشرقین متاثر ہوئے بلکہ بعض عرب علماء نے بھی اس کے اصولوں کو اپنایا، ان میں نمایاں ترین نام مصری ادیب طہٰ حسین ہے، جنہوں نے اس کی کتاب اصول الشعر العربی کے اصول وضوابط پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی کتاب الشعر الجاہلی ۱۹۲۶ء میں تصنیف کی جس نے علمی حلقوں میں ایک طوفان برپا کردیا، مرگولیتھ کی کتاب کا عربی ترجمہ یحییٰ الجبوری نے ایک تفصیلی مقدمے کے ساتھ ۱۹۸۱ء میں موسسۃ الرسالہ بیروت سے شائع کیا ہے۔(۶)

اس کی کتاب محمدؐ اور عروج اسلام (Mohammed and the Rise of Islam) پر مستشرق جوستاف بفانمولر کا ایک تبصرہ یہاں نقل کرنا بہتر ہوگا وہ بیان کرتا ہے ''جہاں تک مرگولیتھ کا تعلق ہے تو اس نے اپنی کتاب محمدؐ اور عروج اسلام کی تصنیف میں کچھ جدید ماخذوں سے استفادہ کیا ہے اور ان مآخذ کو استعمال کرنے میں مرگولیتھ کی علمی قوت اور ضعف دونوں ظاہر ہوتے ہیں، لیکن زیادہ تر حالات میں زندہ تصویر کشی پائی جاتی ہے جو اوروں کے یہاں ملنا مشکل ہے، مرگولیتھ نے اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ جدید دین تاریخ کے سوا کچھ نہیں، اسی طرح سے مرگولیتھ نے کعبہ کے حوالے سے ابراہیمی سنتوں کو محمدؐ کے ہاتھوں زندہ کرنے کے رجحان کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے......مرگولیتھ کی

اپنی رائے کے مطابق ''محمدؐ کی شخصیت جھوٹ وکذب اور مکر وفریب کا مرقع تھی، ان کے اندر ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں تھی نیز وہ ایک ماہر سیاسی کے سوا کچھ نہیں تھے جو دوسروں کو اپنے جادو کے ذریعہ دھوکہ دیتے تھے''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرگولیتھ نے مفروضات کی بنیاد پر اس طرح کی آراء قائم کرنے کے بعد محمدؐ کے اخلاق واوصاف کو سمجھنے کا سارا راستہ اپنے اوپر بند کرلیا، اس کتاب میں غلط بیانیوں کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ قائم ہے۔(۷)

مرگولیتھ کے فکر کی غلطیاں اس کی تمام کتابوں میں جابجا موجود ہیں، چاہے وہ سیرت محمدؐ کے حوالے سے ہو یا عام اسلامی واقعات کے حوالے سے ہوں یا قرآن وحدیث کے متعلق ہو(۸) علامہ شبلی نے اپنی کتاب میں جابجا اس مستشرق کے بیہودہ اعتراضات کا نہایت ہی چابک دستی کے ساتھ جواب دیا ہے۔

۲۷- رینان، ارنسٹ (۱۲۳۸-۱۳۰۹ھ/۱۸۲۳-۱۸۹۲ء) Ernest Renan، قومیت فرانس:

فرانسیسی مستشرق ومفکر رینان نے خاص طور پر یہودی معاشرہ اور عیسائی تاریخ پر پرمغز تحریریں سپرد قلم کیں، فرانس کے شہر ٹریگر (Treguier) میں ایک ملاح کے گھر اس کی پیدائش ہوئی، ابتدائی تعلیم عیسائی اسکول میں ہوئی، مقامی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پیرس کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فلسفہ اور مشرقی زبانوں میں ملکہ پیدا کیا، ابن رشد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مگر عربی زبان میں ہمیشہ کمزور رہا جس کا اس نے اپنی تصنیفات میں اعتراف کیا ہے، کئی مشرقی ملکوں کا سفر بھی کیا، لبنان میں خاصا قیام رہا، یہاں عیسیٰ مسیح پر ایک کتاب بھی لکھی، بعد میں اسے شہرت اسلامی عقائد وفلسفہ میں مخصوص دلچسپی کی وجہ سے ملی، ۱۸۷۸ء میں فرانس کی مجمع لغوی میں ممبر شپ بھی ملی۔

علمی یادگاریں: عربی زبان میں مہارت نہ ہونے کے باوجود اس نے اسلامی تراث کے حوالے سے متعدد مقالات شائع کیے، جن میں سرفہرست مقامات حریری پر ۱۸۵۳ء میں ایک تفصیلی مضمون ہے، ابن بطوطہ کی کتاب کے پہلے فرنچ ترجمہ کے وقت ابن بطوطہ کے نام سے ۱۸۵۳ء میں ایک تحقیقی مضمون شائع کیا، پھر ۱۸۷۳ء میں مسعودی کی کتاب مروج الذہب پر

ایک تفصیلی مضمون شائع کیا، ۱۸۷۷ء میں فردوسی کے شاہنامہ پر اس نے پہلی مرتبہ فرنچ میں مضمون شائع کیا، یہ سارے مضامین اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اسے عربی تراث سے خاص شغف تھا، یہ شوق اس کو یوروپی زبانوں کے ذریعہ سے ہوا، ذیل میں اس کی کچھ کتابوں کے نام دیئے جارہے ہیں: ۱- Averroes et l'averroisme (1852) ۲- Histoire generale et systeme compare des langues semitiques (1855) ۳- Etudes d'histoire religieuse (1857) ۴- De l'origine du lanage (1858) ۵- Essais de morale et de critique (1859) ۶- Cantique des cantiquesLe (1860) ۷- An essay on the age and antiquity of the Book of Nabathaean agriculture. To which is added an inaugural lecture on the position of the Shemitic nations in the history of civilization (1862) ۸- Histoire des origines du Christianisme volumes-1866 - 1881 ۹- Histoire de peuple d'Israel - 5 volumes 1887-1893 ۱۰- Lectures on the Influence of the Institutions, Thought and Culture of Rome on Christianity and the Development of the Catholic Church 1885 (۱۰)

اسلام اور سیرت نبوی کے حوالے سے اس کی کچھ خاص آراء کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱- اسلام: رینان کو عربی و اسلامی ملکوں میں شہرت اس کے اس لکچر سے ملی جو اس نے ۲۹/ مارچ ۱۸۸۳ء میں فرانس کی سربون یونیورسٹی میں ''اسلام اور علم'' کے عنوان سے دیا، اس لکچر میں اسلام پر سخت تنقیدیں کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عربوں کے یہاں علم کے نام سے جو چیز پائی جاتی ہے، عربیت اس میں صرف نام کی ہے یعنی علم کی ترقی میں عربوں کی کوئی شرکت نہیں، یہ بھی کہا کہ علم کی ترقی کی راہ میں اسلام سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اس نے ہمیشہ علم اور فلسفہ پر ظلم کیا ہے، نیز جو لوگ اسلام کا دفاع کرتے ہیں وہ اسلام کو سمجھتے ہی نہیں کہ اسلام میں موجود توحید کا مسئلہ ایسا ہے جس میں روحانی پہلو اور دنیوی پہلو میں فرق کرنا بہت مشکل ہے، اس

مذہب میں عقیدت کی بالادستی ہے اور یہ بھاری بوجھ ہے جسے انسانیت نے اٹھا رکھا ہے۔

۲-سیرت نبویؐ: اسلامی علوم میں رینان کی آخری تحریر سیرت نبوی کے حوالے سے ہے جسے اس نے مستشرق الیسندر رودانکونا (Alessandro D'Ancona) کے تفصیلی مقالہ (یورپ میں محمدؐ کا افسانہ) کے شائع ہونے کے وقت محمدؐ اور اسلامی علوم کے اصول" (Mahomet et l'origine de l'islam) کے عنوان سے لکھا، اس مضمون میں رینان نے محمدؐ کی سیرت کے حوالے سے اپنی خاص آراء ذکر کی ہیں، جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمدؐ نے اپنے دین کے اصول وضوابط عیسائی پادریوں سے حاصل کیے اور اس ضمن میں بحیرا راہب کی شخصیت پر بحث کی ہے، نیز ان عناصر پر تفصیلی بحث کی ہے جنہوں نے بقول اس کے یورپ میں عہد وسطی اور بعد کے زمانے میں محمدؐ کی شخصیت کے حوالے سے دیومالائیت کو فروغ دیا۔(۱۱)

۲۸- کونت ہنری دی کاستریز (۱۲۶۶-۱۳۴۵ھ/۱۸۵۰-۱۹۲۷ء) Cte.H.de Castries، قومیت فرانس:

کاستریز فرانس کی فوج میں ملازم تھا، مغرب عربی میں اپنے طویل قیام کے دوران اس نے اسلامیات کا مطالعہ کیا، مغرب کی تاریخ کے حوالے سے کتابوں کے ایک بڑے مجموعے کے اشاعت میں شرکت کی، جسے "مغرب کی تاریخ کے متعلق غیر مطبوعہ مآخذ" کے عنوان سے شائع کیا گیا۔

علمی یادگاریں: کافی تلاش وجستجو کے بعد بھی ایک کتاب کے علاوہ کسی اور کتاب کا نام نہیں مل سکا لیکن عقیقی کے بیان کے مطابق اسلامی علوم میں اس کے کئی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں، ۱۸۹۶ء میں اس کی کتاب اسلام پر خیالات (L'Islam: Impressions et etudes) پیرس سے شائع ہوئی۔(۱۲)

اسلام کے حوالے سے اس کے خیالات کافی حد تک معتدل ہیں، اس کی اس منصف مزاجی کی وجہ سے کئی مستشرقین نے اسے طعن وتشنیع کا نشانہ بھی بنایا ہے، مثال کے طور پر مستشرق جوستاف بفانمولر اس کی شخصیت اور اس کی کتاب کے حوالے سے رقم طراز ہے: "دی کاستریز کی کتاب میں اسلامی چھاپ ہے لیکن اس کے باوجود اس میں اسلام کے حوالے سے پوری طرح

غیر جانب داری شامل نہیں ہے، کیونکہ اس کی یہ رائے ہے کہ عیسائیت اور وثنیت کے درمیان اسلام ایک ضروری درمیانی کڑی ہے اور وہ افسوس کرتا ہے کہ مستشرقین کی کثیر تعداد دین محمدی کو وثنیت کی ہی ایک شکل سمجھتی ہے۔ اس کی اپنی رائے کے مطابق اسلام عیسائیت سے تین چیزوں میں اختلاف رکھتا ہے: ازدواجی کثرت، جنت کا تصور اور بے سبب توکل۔ (۱۳)

کتاب کے اختتام پر مصنف نے کچھ اہم ضمیمے دیے ہیں خاص طور پر ایک پوری مبسوط فصل محمدؐ اور دین اسلام کے حوالے سے عہد وسطی کی آراء کے لیے خاص ہے۔ محمدؐ کی سیرت کے حوالے سے کاستر یز کی آراء بڑی حد تک مثبت ہیں، اسی طرح اس کے خیال کے مطابق قرآن شروع سے آخر تک یکتا اور بے مثل ہے، مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی یہ کتاب ایک ذاتی تاثر ہے کوئی علمی تحقیق نہیں''۔ (۱۴)

اسلام اور اس کے رسولؐ کے حوالے سے کاستر یز کا مثبت پہلو اختیار کرنا جہاں متعصب مستشرقین کے لیے باعث قلق ہے وہیں منصف مستشرقین کے لیے باعث اطمینان بھی ہے، جیسے کہ فرانسیسی مستشرق الفونس ایتین دینیہ Alphonse Etienne Dinet (۱۲۷۷-۱۳۴۷ھ / ۱۸۶۱-۱۹۲۹ء) جنھوں نے حق کی راہ تلاش کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام سے سرفراز کیا اور اپنا نام ناصر الدین دینیہ Nasr'Eddine Dinet رکھا، انہوں نے اپنی کتاب ''محمدؐ رسول اللہ'' میں کاستر یز کے خیالات کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے، جیسے یہ کہ ''ان مستشرقین کے اقوال بھی عجیب ہیں، اپنے جھوٹے مفروضات میں اس قدر آگے گئے کہ یہ بھی کہہ دیا کہ ''محمدؐ نے اللہ کے نام پر دین قائم کیا اور لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف دعوت دی''، یہ کہنا کتنا عجیب ہے کہ ''محمدؐ (جو بتوں کے دشمن اور بت پرستی کو ختم کرنے والے تھے) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتے تھے'' (۱۵)۔ عقل کو شدید حیرت ہوتی ہے کہ ایک ناخواندہ شخص بھی ایسی آیات پڑھتا ہے جس کے متعلق پورے مشرق نے کھل کر اعتراف کیا کہ لفظی اور معنوی اعتبار سے اس جیسی آیات لانے سے انسانی فکر عاجز ہے، یہ وہی آیات تھیں جسے جب عقبہ بن ربیعہ نے سنا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا، یہ وہی آیات تھیں جنھوں نے عمرؓ بن الخطاب جیسے سخت طبیعت والے انسان کو موم کر دیا نیز انہیں اس بات پر اطمینان دلایا کہ اسلام ایک برحق دین ہے اور پھر وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور جب

اسی قرآن کی سورہ مریم کی آیت نجاشی حبشہ کے دربار میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے تلاوت کی
تو نجاشی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اسے اسلام کی صداقت کا یقین ہو گیا۔(۱۶)

۲۹- اجناس گولڈزیہر (۱۲۶۶-۱۳۳۹ھ/۱۸۵۰-۱۹۲۱ء) Ignac (Yitzhaq
Yehuda) Goldziher، قومیت جرمنی:

ہنگری کے شہر (Szekesfehervar) چتولفیسنبرگ کے ایک مشہور یہودی گھرانے میں پیدا ہوا، ابتدائی تعلیم بوڈاپسٹ (Budapest) میں حاصل کی، پھر برلین اور لپزگ اور لیدن یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کی ڈگری حاصل کی، ۱۸۷۰ء میں یہودی فقہ پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، ۱۸۷۲ء سے بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں تعلیمی خدمات پر مامور کیا گیا لیکن ایک سال کے بعد اسے ہنگرین سرکار نے علمی غرض سے مشرق وسطیٰ بھیج دیا، جہاں یہ شام وفلسطین کا سفر کرتے ہوئے مصر پہنچا اور ازہر شریف میں بعض شیوخ کی علمی مجلسوں میں شرکت کی، یہاں سے بوڈاپسٹ واپسی ہوئی جہاں اس نے پوری زندگی سامی زبانوں کے استاذ کی حیثیت سے علم وتحقیق میں گذار دی۔

علمی یادگاریں: اس کے شائع شدہ ۵۹۲ تحقیقی مضامین شمار کیے گئے ہیں، درج ذیل میں کچھ اہم کتابوں کے نام دیے جا رہے ہیں: ۱- Tagebuch, Edited by Alexander
Scheiber, Leiden: Brill 1978 ۔۲- zur Literaturgeschichte der Shi'a
1874 ۔۳- Beitrage zur Geschichte der Sprachgelehrsamkeit bei den
Arabern, Vienna, 1871-1873 ۔۴- Der Mythos bei den Hebraern und
seine geschichtliche Entwickelung Leipzig, 1876 ۔۵-
Muhammedanische Studien (Muslim Studies) (Halle) 1889-1890, 2
Vols ۔۶- Abhandlungen zur arabischen Philologie, Leiden,
1896-1899, 2vols ۔(۱۷)

تحقیقی اصول: اس نے اسلامی تحقیقات کے لیے ایک ایسا مخصوص اصول ونظریہ قائم کیا جو اس سے پہلے استشراق کی دنیا میں متعارف نہیں تھا وہ یہ کہ مذہب اسلام کی تحقیق مکاں کے اعتبار سے نہیں بلکہ زماں کے اعتبار سے ساکن نظریہ کی جگہ متحرک نظریہ سے اور مذہبی نظریہ کی

بجائے تاریخی نظریہ سے ہو، یعنی اس کے مطابق اسلامی عقائد، تعلیمات اور علوم ایک موجود و زندہ مخلوق کی طرح ہیں، جن کی تخلیق ہوئی، کمال کو پہنچے اور پھر ان میں انحطاط آیا اور پھر وہ فنا کی منزل سے قریب ہوئے، اسی نظریے کے تحت اس نے حدیث وفقہ میں شک ظاہر کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ ان کی تدوین کا کام حضورؐ کی وفات کے نوے برس بعد شروع ہوا، لہٰذا ان میں اسلام کی دینی تاریخی ومعاشرتی ترقی کا عکس پہلی اور دوسری صدی ہجری میں داخل ہوا، یعنی یہ کہ مسلمانوں نے حالات کے پیش نظر اس میں کمی زیادتی کی اور یہ کہ انہوں نے اسلامی فقہ کی تدوین میں رومن ماخذ سے پورا استفادہ کیا، لہٰذا حدیث وفقہ کو دین اسلام کا مصدر قرار دینا صحیح نہیں اور اس پر اعتماد بھی نہیں کیا جاسکتا، اپنے باطل نظریات میں اس نے بہت شہرت حاصل کی اور یورپ میں اس کی کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے بعد کے مستشرقین اس کے ان باطل اصولوں کو سنگ میل سمجھتے ہوئے اس کی روش پر چلے اور اسلامی مطالعہ میں غلط نتائج نکالے۔(۱۸)

گولڈ زیہر کی یہ زہر افشانیاں اس کی کتاب ''مطالعہ اسلام'' اور ''اسلام کے متعلق لکچرز''(۱۹) (جو ترتیب وار ۱۸۸۹-۱۸۹۰ء میں جرمن زبان میں شائع ہوئیں) میں موجود ہیں (۲۰)۔ جن کے مطالعہ کے بعد مستشرقین نے ان ہی خیالات کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے (۲۱) ان مستشرقین نے اصول حدیث اور تاریخ حدیث پر مسلمانوں کا جو موقف ابتدا سے رہا ہے اور جو ہر دور کی تصانیف میں درج ہے ان پر کبھی توجہ نہیں کی اور کسی اہمیت کے لائق نہیں سمجھا۔(۲۲)

یہاں یہ ذکر کرنا مفید ہوگا کہ علامہ شبلی کی فہرست میں مستشرقین کی تعداد ۳۷ ہے مگر میں صرف انتیس لوگوں کے متعلق ہی معلومات جمع کرسکا، اس کے علاوہ اس میں سیرت کے حوالے سے پانچ مضامین ہیں جو ان کے وقت میں انگلستان کے مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے۔(۲۳)

خلاصہ کلام: ۱- استشراق اپنے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں مختلف مطالب و مقاصد لیے ہوئے ہے جس کی وضاحت علمائے اسلام اور علمائے یورپ کرتے آئے ہیں، استشراق کے وسیع مفہوم میں عربی زبان وادب کے علاوہ مشرقی ممالک کا تمام علمی سرمایہ اور تاریخ وتمدن بھی شامل ہے جس کا مقصد وحید عیسائیت کو مشرقی ممالک میں پھیلانا ہے، مشنریوں کے ذریعہ

علمی اور ثقافتی قوت کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی تسلط قائم کرنا تھا لیکن یورپ کے ان سارے مقاصد کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ اسلام اور اسلامی حکومتیں تھیں، اسے دور کرنے کے لیے یورپی ملکوں نے دینی، سیاسی، تجارتی اور ثقافتی سارے حربے اپنائے، استشراق سب سے بڑا ہتھیار تھا اسی لیے یورپی ممالک نے اس کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کیا، چونکہ یورپ کے پاس اپنا کوئی تراث تو تھا نہیں لہٰذا وقت کے ساتھ ساتھ مشرق ہی یورپ کے تراث کا بنیادی جزء بن گیا، جس نے حقیقت میں یورپ کو سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور تمدنی ترقی مہیا کی، ہماری گزارشات سے اس بات کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ استشراق کے میدان میں ایک جماعت ایسی بھی رہی جو خالص علمی مقصد کے تحت مشرقی علوم اور اسلامی تحقیقات کے کام میں لگی رہی لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، ان میں اکثر جرمنی اور فرانس کے ہی مستشرقین ہیں، بعض ان میں سے مشرف بہ اسلام بھی ہوئے۔

۲- یہ بات بھی واضح ہوئی کہ استشراق یورپ کے سیاسی وتمدنی تسلط کا ایک واضح اشارہ ہے، اس کے بعد ثقافتی تسلط کا معاملہ درپیش ہوا جس کے لیے استشراق کی کنجی استعمال کرنی پڑی، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندی مسلمانوں کا سیاسی اور اقتصادی مال ومتاع تو لٹ چکا تھا لیکن اب انہیں اپنے مذہبی اور ثقافتی ورثہ کے بچانے کی فکر لاحق ہوئی، علماء نے وقت کے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے ایک کامیاب محاذ قائم کیا اور مذہبی اور ثقافتی میدانوں میں کھل کر مستشرقین کا مقابلہ کیا اور مستشرقین کے اسلوب میں ان کا جواب دیا، ایک چیز ان علمائے اسلام میں یہ بھی مشترک رہی کہ انہوں نے زبانی اور تحریری مناظروں کے ذریعہ مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیا، مستشرقین کے علمی اور تحقیقی کاموں سے نہ صرف آگاہی حاصل کی بلکہ ان کی اہم کتابوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی کیا تاکہ ہندوستانی معاشرہ کا ہر طبقہ مستشرقین کی زہر افشانی کو سمجھے، البتہ منصف مستشرقین کے خیالات کو اپنی تصنیفات میں جگہ دی ان کی تعریف بھی کی اور ان کے اخلاقی پہلوؤں کا اعتراف بھی کیا۔

۳- علامہ شبلی نعمانی ہندوستان کے ان چند صف اول کے علماء میں سے ہیں جنہوں نے استعمار اور استشراق کے خطرے کو وقت پر محسوس کیا اور ان کے مدمقابل کھڑے ہوئے، وہ نہ

صرف ایک جامع الکمالات، متنوع الصفات اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے بلکہ اپنی جدت اسلوب اور ندرت تحقیق سے انہوں نے مستشرقین کے رعب کے غبارے کی ہوا نکال دی، مستشرقین کا جواب دینے کے لیے مشاہیر اسلام کا جو سلسلہ انہوں نے شروع کیا اور اپنی تصنیفات میں جو اصول وضوابط رکھے عالم اسلام کے لیے اس وقت ایک نئی چیز تھی، اس میدان میں وہ اس خاص نگارش کے بانی ہیں، انہوں نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب سیرت النبیؐ میں جن مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، ان کے تعارف کے علاوہ چند چیزوں کی اس مقالہ کے ذریعہ مزید وضاحت ہوئی ہے، جو ذیل میں پیش ہے:

الف: اکثر مستشرقین علامہ شبلی کے معاصر تھے اور ان کی تصنیفات علامہ کو حاصل ہوئیں اور انہوں نے نہ صرف انہیں پڑھا بلکہ ان کے جدید اسلوب کو اپنی سیرت نگاری میں مثبت انداز میں استعمال کیا، باوجودیکہ علامہ کا اصل اصول وقاعدہ روایت اور درایت ہی ہر جگہ غالب رہا۔

ب: علامہ کے ذکر کردہ مستشرقین کو اسلامی تحقیقات میں امامت کا درجہ حاصل ہے، علامہ نے ان مستشرقین کے نام کے ساتھ ان کی صرف ان ہی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو اصول الدین، سیرت نبوی اور اسلامی تاریخ سے متعلق ہیں، علامہ شبلی نے اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے تو بعض انصاف پسند مستشرقین کے اقتباسات سے سیرت النبیؐ میں استدلال بھی کیا۔

ت: مذکورہ بالا بحث کے بعد یہ واضح ہے کہ استشراق کوئی علم نہیں بلکہ وہ مجرد ایک تقلید ہے، جس میں صدیوں کی طبع آزمائی اور تدلیس وتلبیس سے اسے ترقی ملتی گئی، اسلامیات اور سیرت نبویؐ کے متعلق ان کی تقریباً ساری تصنیفات میں چند معاندانہ اصول ہمیشہ مشترک رہے۔

ث: یہ بات بھی واضح ہوئی کہ مستشرقین کا اصل مقصد اسلامی تعلیمات کو مسخ کرکے اسلام کا خاتمہ ہے اس مقصد کے لیے انہوں نے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا، اس کے لیے انہوں نے علمی پیرائے میں قرآن کریم اور احادیث نبویؐ میں تشکیک وشبہات پیدا کرنے کے لیے زہر افشانیاں کیں اور خیالات فاسدہ وافکار باطلہ کو پھیلانے کی کوشش کی لیکن ہر ممکن کوشش کے بعد بھی ان کے جہل ومکر کا چہرہ چھپا نہیں رہا، ایک نکتہ اعتراض اٹھا تو دوسرے مقام پر یا تو وہ خود اپنی رد کی ہوئی بات سے دلیل لیتا نظر آتا ہے یا اس کا لاحق اس کے جھوٹے اعتراض کا جواب دیتا ہے، اس طرح ان

کے اپنے اقوال میں جگہ جگہ واضح تضاد نظر آتا ہے۔

حواشی

(۱) دیکھیں عقیقی: مستشرقون، ج ۲، ص ۴۱۴۔ (۲) محمود حمدی زقزوق: سیرۃ الرسولؐ فی تصورات الغربیین، ص ۱۴۴-۱۴۶۔ (۳) For more information see Encyclopaedia Judaica, Vol 4, S.14۔ (۴) تفصیل کے لیے دیکھیں محمود حمدی زقزوق: سیرۃ الرسولؐ فی تصورات الغربیین، ص ۱۵۶-۱۵۷۔ (۵) Encyclopaedia Britannica (14th edition) - article Margoliouth, David Samuel۔ (۶) دیکھیں محمود حمدی زقزوق: الاسلام فی الفکر الاستشراقی، ص ۱۳۵/ مرگولیتھ کی یہ کتاب دراصل ایک تفصیلی مضمون پر مشتمل تھی اس کو جنرل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۹۲۵ء میں (The Origins of Arabic Poetry) کے عنوان سے شائع کیا تھا، اس کے حوالے سے ایک بہت ہی ناقدانہ بحث ''موقف مرجلیوث من الشعر العربی'' کے عنوان سے ڈاکٹر مصطفیٰ ہدارہ نے مناہج المستشرقین فی الدراسات العربیہ الاسلامیہ، جلد اول میں کی ہے، سن اشاعت ۱۹۸۵ء، تونس، ص ۳۹۵-۴۳۸۔ (۷) تفصیل کے لیے دیکھیں محمود حمدی زقزوق: سیرۃ الرسول فی تصورات الغربیین، ص ۱۵۷-۱۵۸۔ (۸) سیرت نبوی اور اسلامی اصول و عقائد کے حوالے سے مرگولیتھ کے اعتراضات کے جواب کے لیے درج ذیل کتاب دیکھیں جو اس باب میں بہت ہی مفید ہے: Muhammad Mohar Ali : Sirat-Al Nabi and the Orientalits, Vol. IA From the background to the beginning of th Prophet's Mission, P. King Fahd complex for the printing of the Holy Qur'an Madinah, 1997, P.743-763-789۔ (۹) تفصیل کے لیے دیکھیں سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۶۶-۶۷-۸۵-۹۸-۱۰۵-۱۷۵-۲۷۰-۱۴۵/ ج ۲، ص ۱۲/ ج ۴، ص ۲۱۰۔ (۱۰) تفصیل کے لیے دیکھیں عقیقی: مستشرقون، ج ۱، ص ۱۹۱۔ (۱۱) تفصیل کے لیے دیکھیں عبدالرحمٰن بدوی: موسوعۃ المستشرقین، ص ۳۱۱-۳۲۰/ ایضاً محمود حمدی زقزوق: سیرۃ الرسولؐ فی تصورات الغربیین، ص ۹۷۔ (۱۲) دیکھیں عقیقی: مستشرقون، ج ۱، ص ۲۱۰/ اس کتاب کا عربی ترجمہ بہت پہلے ہی ''الاسلام: خواطر وسوانح'' کے نام سے شائع ہو گیا تھا، ۲۰۰۵ء میں مصر کی سرکاری اکیڈمی المجلس الاعلی للثقافۃ سے اسے دوبارہ شائع کیا گیا ہے، پتہ نہیں کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ ہوا ہے یا نہیں؟۔ (۱۳) لفظ (Fatalism) کے معنی عربی میں توکل کے آتے ہیں جس کے معنی بے اسباب بھروسہ کرنا اور اس کا اسلام سے کوئی لینا دینا نہیں بلکہ جو چیز اسلام میں ہے وہ توکل مع اسباب ہے۔ (۱۴) جوستاف بفانمولر کے

تبصرے کے لیے دیکھیں محمود حمدی زقزوق : سیرۃ الرسولؐ فی تصورات الغربیین ،ص ۱۴۵-۱۴۶۔(۱۵) علامہ شبلی نے بھی اس کا یہ قول سیرت النبیؐ کی پہلی جلد میں اسی کی کتاب سے نقل کیا ہے، دیکھیں ص ۶۴-۶۵۔(۱۶) تفصیل کے لیے دیکھیں اتین دینیہ :محمد رسول اللہؐ،عربی ترجمہ،عبدالحلیم محمود رمحمد عبدالحلیم، ط: قاہرہ، ص ۱۲-۱۶۔ (۱۷) Robert Simon: Ignac Goldziher, Leiden, Brill 1986 / Ignac Goldziher, Tagebuch, Leiden 1978۔(۱۸) گولڈ زیہر کی کتاب مطالعہ اسلام میں حدیث، فقہ وسیرت پر کیے گئے اعتراضات کا سب سے بہترین جواب مصطفیٰ السباعی نے اپنی کتاب السنہ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی کے ذریعہ دیا ہے۔(۱۹) اس کتاب کا عربی ترجمہ محمد یوسف اور ان کے رفقاء نے العقیدہ والشریعہ فی الاسلام : تاریخ التطور العقدی والتشریعی فی الدین الاسلامی کے عنوان سے مصر سے شائع کیا ہے۔(۲۰) مستشرق جوستاف بفانمولر نے گولڈزیہر کی اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے، دیکھیں محمود حمدی زقزوق : الاسلام فی الفکر الاستشراقی ،ص ۱۲۴-۱۲۹ راس کے علاوہ عبدالرحمٰن بدوی نے بھی اس کی کتابوں پر سیر حاصل بحث کی ہے، دیکھیں موسوعۃ المستشرقین ،ص ۱۹۷-۲۰۳۔(۲۱) محمود حمدی زقزوق : سیرۃ الرسولؐ فی تصورات الغربیین ،ص ۱۵۸-۱۵۹۔(۲۲) مستشرقین کی اسلامی تحقیقات پر جتنا اثر گولڈزیہر کا ہوا ہے، اتنا اس کے کسی دوسرے معاصر مستشرق کا نہیں ہوا، اس باب میں بہتیرے مستشرقین ہیں جنہوں نے گولڈزیہر کی تصنیفات کو قابل اعتماد سمجھتے ہوئے حدیث کے حوالے سے اعتراضات کیے ہیں، جن میں سرفہرست کینیڈین مستشرق آرتھر جیفری Arthur Jyffery (۱۳۰۹-۱۳۷۸ھ/۱۸۹۲-۱۹۵۹ء) ہے۔(۲۳) یہ مضامین حسب ذیل ہیں: ۱-مضمون نگار نیشنل ریویو (انگلستان): مضمون محمدؐ، ۱۸۵۸ء/۲-مضمون نگار نیشنل ریویو (انگلستان): بزرگ ترین عرب ۱۸۶۱ء/ ۳-دوشیف مضمون نگار کوارٹرلی ریویو (انگلستان): اسلام ۱۸۶۹ء/۴-مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو (انگلستان): محمد ۱۸۷۲ء/۵-مضمون نگار کانٹمپریری ریویو (انگلستان): محمد اور اسلام ۱۸۷۵ء۔ دیکھیں سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۶۷-۶۸-۶۹۔

کتابیات (عربی کتب)

۱۔السید محمد الشاہد: الاستشراق ومنہجیہ النقد عند المسلمین المعاصرین، ط: ۱۹۹۴ء۔

۲۔حسن ضیاء الدین عتر: الاستشراق نشأتہ واہدافہ، ط: مجلّہ کلیہ الشریعہ مکہ مکرمہ، ۱۴۰۰/۱۴۰۱ھ۔

۳۔فاروق عمر فوزی: الاستشراق والتاریخ الاسلامی (القرون الاسلامیہ الاولی) دراسۃ مقارنۃ بین وجہۃ النظر

الاسلامیۃ ووجہۃ النظر الاوروبیۃ، ط: مکتبہ الاہلیۃ للنشر والتوزیع، عمان الاردن، ۱۹۹۸ء۔

۴۔محمود حمدی زقزوق: الاستشراق والخلیفۃ الفکریۃ للصراع الحضاری، ط: دار المعارف القاہرہ، ۱۹۹۷ء۔

۵۔سمایلوفتش: فلسفۃ الاستشراق واثرہا فی الادب العربی المعاصر، ط: دار المعارف القاہرہ، ۱۹۸۰ء۔

۶۔مصطفیٰ السباعی: الاستشراق والمستشرقون مالہم وما علیہم، ط: المکتب الاسلامی بیروت، ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء۔

۷۔الاسلام والمستشرقون، ط: دار المصنّفین اکادیمیہ شبلی النعمانی، اعظم کرہ الہند، ۱۹۸۲ء۔

۸۔عبدالقہار عبدالواحد: الاستشراق والدراسات الاسلامیۃ، ط: دار الفرقان، عمان، ۲۰۰۰ء۔

۹۔عبدالعظیم الدیب: مقالۃ المستشرقون والتاریخ، نشر فی کتاب الاسلام والمستشرقون، ط: دار المصنّفین اکادیمیہ، شبلی النعمانی، اعظم کرہ الہند، ۱۹۸۲ء۔

۱۰۔علی بن ابراہیم الحمد النملۃ: الاستشراق والدراسات الاسلامیۃ، ط: مکتبۃ التوبۃ، الریاض ۱۴۱۸ھ/۱۹۹۸ء۔

۱۱۔توماس آرنولد: الدعوۃ الی الاسلام، ترجمہ حسن ابراہیم حسن وآخرین، ط: مکتبۃ النہضۃ المصریۃ، ۱۹۴۷ء۔

۱۲۔کارلائل: الابطال، عربی ترجمہ محمد السباعی، ط: مکتبہ مصر قاہرہ۔

۱۳۔سلیمان الندوی: الرسالۃ المحمدیۃ، ط: الدار السعودیۃ للنشر والتوزیع، ۱۹۸۴ء۔

۱۴۔زین العابدین المعبری: تحفۃ المجاہدین فی بعض اخبار البرتغالیین، حققہ وقدم لہ وعلق علیہ امین توفیق الطیبی، ط: کلیۃ الدعوۃ الاسلامیۃ، طرابلس، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۸ء۔

۱۵۔نجیب العقیقی: المستشرقون، ۳ مجلدات، ط۵: دار المعارف قاہرہ، ۲۰۰۶ء۔

۱۶۔ابوالحسن الندوی، روائع اقبال، ط: دار القلم، ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء۔

۱۷۔جوستاف بفانمولر: الاسلام فی الفکر الاستشراقی، ترجمہ محمود حمدی زقزوق، ط: قاہرہ۔

۱۸۔پارٹ: الدراسات العربیہ والاسلامیہ فی الجامعات الالمانیہ، ترجمہ مصطفیٰ ماہر، ط: قاہرہ۔

۱۹۔فلہاوزن: تاریخ الدولۃ العربیہ من ظہور الاسلام الی نہایۃ الدولۃ الامویۃ، ترجمہ عبدالہادی ابوریدۃ، مراجعۃ حسین مونسو ط۲: القاہرۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، ۱۹۶۸ء۔

۲۰۔صلاح الدین المنجد: المستشرقون الالمان، تراجمہم وما اسہموا بہ فی الدراسات العربیہ، ط: دار الکتب الجدید، بیروت لبنان، ۱۹۷۸ء۔

۲۱۔عبدالرحمٰن بدوی: موسوعۃ المستشرقین، ط۳: دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۹۳ء۔

۲۲۔ مجموعۃ من الباحثین : مناہج المستشرقین فی الدراسات العربیۃ الاسلامیہ، مجلدین، ط: تونس ۱۹۸۵ء۔

۲۳۔ اتین دینیہ: محمد رسول اللہؐ، عربی ترجمہ، عبدالحلیم محمود، محمد عبدالحلیم، ط: قاہرہ۔

۲۴۔ اجناس جولدتسیہر: العقیدہ والشریعۃ فی الاسلام، ترجمہ محمد یوسف موسیٰ ورفقاء، ط۲: دارالکتب الحدیثۃ، مصر۔

اردو کتب

۱۔ شبلی النعمانی وسلیمان الندوی: سیرت النبیؐ، ۷ مجلدات، ط: لاہور، ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۷ء۔

۲۔ عطاء اللہ قاسمی: ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ، ط: ادارہ شاہ ولی اللہ، دہلی ۲۰۰۸ء۔

۳۔ محمد ضیاء الدین انصاری: مولانا آزاد سرسید اور علی گڑھ: انجمن ترقی اردو دہلی۔

۴۔ الطاف حسین حالی: حیات جاوید، ط۳: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی الہند، ۱۹۹۰ء۔

۵۔ شبلی نعمانی: مقالات شبلی، ط: دارالمصنّفین، ۱۹۲۷۔

۶۔ شبلی نعمانی: الفاروق مجلدین، ط: دارالمصنّفین، ۱۹۹۸ء۔

۷۔ شبلی نعمانی: سفرنامہ، ط: دارالمصنّفین، ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء۔

۸۔ شبلی نعمانی: اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ط: دارالمصنّفین، ۱۹۹۹ء۔

۹۔ شبلی نعمانی: مضامین عالم گیری، مطبوعہ انتظامی واقع کانپور، ۱۹۱۱ء۔

۱۰۔ شبلی نعمانی: المامون، ط: دارالمصنّفین، ۱۹۲۶ء۔

لغت کی کتابیں

۱۔ المعجم الوسیط، ج۱، ط: مجمع اللغۃ العربیۃ، القاہرہ۔

۲۔ محمد فرید وجدی: دائرہ معارف القرن العشرین، قاہرہ۔

۳۔ The encyclopaedia of missions, New York-London 1904۔

۴۔ Encyclopaedia Judaica, Vol.4۔

۵۔ Encyclopaedia Britannica (14th edition)۔

میگزین

۱۔ سیرۃ الرسولؐ فی تصورات الغربیین، فصول مختاریہ من کتابات المستشرق الالمانی جوستاف بفانمولر، ترجمہا وقدم لہا وعلق علیہا محمود حمدی زقزوق، مجلۃ مرکز بحوث السنۃ والسیرۃ، العدد الثانی، ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء۔

۲۔ The Lion, No. 1 Vol. 4. London, Friday, July 3, 1829۔

کتابیات مزارات

ڈاکٹر عارف نوشاہی

مختلف مذاہب عالم اور اقوام میں جن مقامات کو تقدس کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ان میں وہ مقام بھی شامل ہے جو کسی قوم کے فوت شدگان سے متعلق ہوتا ہے۔ جسے ہماری اسلامی تہذیب میں مدفن، مزار، قبر، مقبرہ، روضہ، تربت اور آرام گاہ وغیرہ کہا جاتا ہے۔یعنی وہ جگہ جہاں مرنے کے بعد خاکی جسم کو سپرد خاک کیا جاتا ہے۔شریعت کے احکام سے قطع نظر اور فقہی مسائل میں الجھے بغیر، یہ بات حقیقت کا درجہ رکھتی ہے کہ ہر دور کے اسلامی معاشروں میں زیارت قبور اور ان سے توسل و استمداد، سواد اعظم کے مذہبی شعائر میں شامل رہا ہے اور اب بھی اکثر و بیشتر مسلمان معاشروں میں ان شعائر پر عمل ہو رہا ہے۔ان مقامات نے، جنہیں ہم مدفن کہتے ہیں، سابقہ دور کے مسلمانوں کے ہاں جو تاریخی، سیاسی اور معاشی تبدیلیاں پیدا کیں وہ بھی ایک الگ بحث ہے۔زائرین پر ان مقامات کی زیارت سے جو روحانی اور نفسیاتی اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اپنی جگہ پر ہیں۔اگر کوئی مدفن مذہبی، سیاسی اور علمی لحاظ سے کسی اہم شخصیت کا ہو تو وہ مقام اس علاقے کی مزید آبادی کا باعث بنتا ہے۔جدید دور میں اسے شعبۂ سیاحت سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔مدفن سے وابستہ ایک اور ثقافتی پہلو فن تعمیر کا ہے۔ ہمارے خطے میں ''تاج محل'' کی مثال کافی ہے جو ایک جامع الفنون عمارت ہے یعنی فن تعمیر کا شاہکار بھی ہے اور سیاحت کا مرکز ہونے کے باعث جلب زر کا ذریعہ بھی بنی ہوئی ہے۔فن تعمیر کے بطن سے دو اور فن نکلے جسے مورخوں نے بہت اہمیت دی ہے۔ ایک کتبہ نگاری اور دوسرا ان کتبات کے لکھنے والے خوش نویسوں کے حالات کی جستجو۔

اسلام آباد۔

ان مختصر اشارات سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ زندگی میں کسی شخصیت کی اہمیت کے مطابق، وفات کے بعد بھی اس کا مدفن تاریخ میں اپنا مقام بنالیتا ہے۔ اس مقام کی اہمیت سے ہمیں کبھی کوئی مورخ آگاہ کرتا ہے، کبھی جغرافیہ دان، کبھی کتبہ شناس، کبھی تذکرہ نویس اور کبھی کوئی سیاح یا سفرنامہ نگار۔

محولہ موضوع پر کتب لکھنے کے محرکات مختلف رہے ہیں۔ کبھی بلاد اسلامی کی مذہبی، سیاسی اور علمی اہمیت محققین اور مصنّفین کے پیش نظر رہی ہے۔ کبھی کسی ایک اہم شخصیت کے مدفن کے باعث اس کے قرب و جوار میں دیگر مدفونین بھی قابل ذکر سمجھے گئے ہیں۔ اس طرح ہمیں ایک طرف شہروں اور آبادیوں کے حوالے سے مزارات کے تذکرے ملتے ہیں اور دوسری طرف خاص ایک قبرستان کے مدفونین کے تذکرے بھی لکھے گئے ہیں۔ کچھ کتب عمومی نوعیت کی بھی ہیں یعنی مختلف بلاد اسلامی میں مدفون مشاہیر کے مزارات کا ذکر یکجا کردیا گیا ہے۔ اس موضوع پر مستقل بالذات کتب حوالہ کے علاوہ مختلف شہروں/آبادیوں کی جو تواریخ لکھی گئی ہیں ان کا ایک باب وہاں کے مقامات مقدسہ کے بارے میں ضرور ہوتا ہے جس میں مزارات بھی شامل ہیں۔ غرضے کہ صدیوں پر محیط اس فن کے حوالے سے اب تک مزارات کے محل وقوع، مدفونین کے حالات اور کتبات والواح قبور کی نقول پر مشتمل عظیم علمی سرمایہ سامنے آچکا ہے۔ اس کی ہر شاخ سے وابستہ جو کتب، اسلامی ممالک میں رائج چند بڑی زبانوں (عربی، فارسی، ترکی، اردو، انگریزی) میں تالیف ہوکر شائع ہوچکی ہیں اگر کوئی محقق دل جمعی کے ساتھ ان سب کا شمار کرے تو یقیناً ایک مستقل کتابیات اسی موضوع پر تالیف ہوسکتی ہے۔

ہم اس مضمون میں اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس فن تصنیف کا پس منظر اور روایت بتانے کے لیے صرف چیدہ چیدہ کتب کا ذکر ہی کرپائیں گے۔ مضمون میں پہلے عمومی نوعیت کی کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے؛ اس کے بعد آبادیوں/شہروں کے حوالے سے کچھ کتب کا تذکرہ ہے۔ میری افتاد طبع کا تقاضا ہے کہ اس مضمون میں فارسی کتب کا تذکرہ زیادہ سے زیادہ کروں جب کہ اس موضوع پر عربی سرمایۂ ادب، بلاد اسلامیہ کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے لیکن عربی آثار میرا موضوع نہیں ہے۔ کتبہ شناسی اور الواح قبور کی نقول پر مبنی کتب کا ذکر اس لیے کم

آئے گا کہ خاص اس موضوع کا تعلق تذکرہ نویسی سے زیادہ آثاریات سے ہے۔ ہاں چند ایسی کتب کا تذکرہ ضرور ہوگا جس میں الواح قبور کے ساتھ صاحب قبر کا تذکرہ بھی ہے۔

عمومی نوعیت کی کتب

عربی کتب: المقابر المشہورۃ والمشاہد المزورۃ، شیخ تاج الدین علی بن انجب البغدادی (م ۶۷۴ھ) بحوالہ کشف الظنون، ۲: ۱۷۷۸؛ مخطوطہ مکتوبہ ۷۶۹ھ/۱۳۶۷ء، ورق ۹۴ تا ۱۲۲ الف، مخزونہ اماسیہ لائبریری، ترکی، نمبر AMASYA IL H, 001584/9۔

الاشارات الی معرفۃ المزارات، ابوالحسن علی بن ابوبکر بن علی الھروی، سال تالیف ۶۱۱ھ/۱۲۱۴ء، مخطوطہ بلا تاریخ مخزونہ سلیمیہ کتب خانہ، ادرنہ، ترکی، نمبر ۰۰۱۵۴۳۔

نورالانوار فی فضائل وتراجم وتواریخ ومناقب ومزارات آل البیت الاطہار (عربی)، سید حسین محمد الرفاعی، مطبوعہ مصر، ۱۳۵۶ھ۔

مزارات اہل بیت علیہم السلام و تاریخہ، محمد حسین الحسینی الجلالی، موسسۃ العلمی للمطبوعات، بیروت، طبع جدید ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء، ۳۶۸ صفحات۔

موسوعۃ العتبات المقدسۃ، جعفر الخلیلی طبع دوم، ۱۴۰۷ھ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، قدس شریف نجف اشرف، کربلائے معلیٰ وغیرہ میں مقدس مقامات مشمولہ مزارات کا باتصویر انسائیکلوپیڈیا ہے۔

فارسی کتب: آرام گاہ ہای خاندان پاک پیامبر، سید عبدالرزاق کمونہ حسینی کی عربی کتاب کا فارسی ترجمہ ہے، مترجم عبدالعلی صاحبی، بنیاد پژوہش ہای اسلامی، مشہد، ۱۳۸۷ش/۲۰۰۸ء، ائمہ، ان کی اولاد اور صحابہ رسول کی آرام گاہوں کا تذکرہ ہے۔

مزار پیامبران، رامین رامین نژاد، بنیاد پژوہش ہای اسلامی، مشہد، ۱۳۸۷ش/۲۰۰۸ء، ایشیا، افریقا اور یورپ میں ۱۵۲ انبیاء سے منسوب مزارات کا محل وقوع، تاریخی پس منظر اور انبیاء کے حالات ہیں۔

رسالہ فی المزارات، خواجہ محمد پارسا بخاری (م ۸۲۲ھ) مرید خواجہ بہاء الدین نقشبند، قدس شریف، دمشق اور بغداد کے اہم مزارات ومقامات مقدسہ کا مختصر تذکرہ ہے۔ قلمی نسخہ مخزونہ کتب خانہ سلیمانیہ، ذخیرہ حمیدیہ، استنبول، شمارہ ۱۴۵۵، ورق ۱۰۸ ب تا ۱۱۳ ب۔

اردو کتب: مزارات حرمین شریفین، علی شبیر، حیدرآباد، مطبوعہ ۱۳۴۷ھ (بحوالہ مقدمہ حسام الدین راشدی برمکلی نامہ)

آبادیوں کے لحاظ سے کتب (آبادیوں کے اسماء کی تہجی ترتیب سے)

ادرنہ (ترکی): *Edirne turbeleri ve evlad-i fatihan mezarlari.* / Oral Onur, Edirne, 1994. 49 pages۔ ادرنہ شہر کے اہم مزارات کا تذکرہ ہے، ان مزارات میں اس شہر کے فاتحین کی اولاد کے مزارات بھی شامل ہیں۔

استنبول (ترکی): مراقد معتبرۂ اسکودار (ترکی زبان، عربی رسم الخط) از اسماعیل حقی بجتی اسکوداری، استنبول کے محلّہ اسکودار Uskudar میں واقع اہم مزارات کا تذکرہ ہے۔ قلمی نسخہ مخزونہ کتب خانہ حاجی سلیم آغا، ذخیرۂ ہدائی، استنبول، شمارہ ۱۱۹۶، ۴۹ ورق، تاریخ کتابت ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء۔

Muze-i Humyun Luhud ve Mekabir-i Atika Katalogu, Istanbul, Mahmud Bey Matbaasi, 1317. 116pp.۔ استنبول کے تاریخی مقابر اور شاہی عجائب خانہ میں محفوظ کتبات کی فہرست ہے۔ مصنف نامعلوم، مطبع محمود بے، ۱۳۱۷ھ۔ Hans Peter Laqueur, Osmanische Friedhofe und Grabsteine in Istanbul, Tubingen 1993 (in Germany). Turkish translation by Selahattin Diliduzgun, Turkish title: Huve'l-baki: Istanbul'da Osmanli mezarliklari ve mezar taslari, Istanbul, 1997, 289pp۔

اسلام آباد (پاکستان): آسودگان خاک اسلام آباد، محمد منیر احمد سلیچ، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، اسلام آباد اور قرب و جوار میں مدفون نامور شخصیات کے احوال اور الواح قبور ہیں۔

اصفہان (ایران): تخت فولاد (فارسی)، مصلح الدین مہدوی، تخت فولاد اصفہان کا قدیم تاریخی قبرستان ہے، یہ کتاب وہاں کے بارے میں ہے۔

رجال اصفہان یا تذکرۃ القبور (فارسی)، عبدالکریم بن مہدی جزی برخواری، باحواشی و ملحقات سید مصلح الدین مہدوی، ۱۳۲۸ش (طبع اول)؛ دوسرا ایڈیشن تذکرۃ القبور بہ ضمیمہ اشعار

ومثنویات کے نام سے ناصر باقری بید ہندی نے مرتب کیا، ناشر کتاب خانہ آیت اللہ مرعشی، قم، ۱۳۷۱ش۔

اوچ (پاکستان): سفرنامہ اوچ (اردو)، سید شریف احمد شرافت نوشاہی (م ۱۹۸۳ء)، اردو اکیڈمی بہاول پور، ۱۹۹۹ء، مصنف نے ۱۹۳۴ء میں اوچ کا سفر کیا تھا۔ اس سفر نامے میں وہاں واقع مزارات اور مدفونین کا مختصر ذکر بھی ہے۔

اورنگ آباد (ہندوستان): روضۃ الاولیاء (فارسی، سال تصنیف ۱۱۶۱ھ)، میر غلام علی آزاد بلگرامی، خلد آباد عرف روضہ میں مدفون دس شخصیات کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے۔ آخری بار ڈاکٹر محمد شعائر اللہ وجیہی کے اردو ترجمے اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۹۶ء میں رام پور سے شائع ہوئی، ۱۱۶ صفحات۔

ایران: آرام گاہ درگسترہ فرہنگ ایرانی (فارسی) از ڈاکٹر غروبی (۱۳۷۶ش)۔ ایران میں ایک صاحب محمد مہدی فقیہ محمد جلالی بحر العلوم گیلانی ہیں۔ انہوں نے ایرانی شہروں اور قصبات کے مزارات اور مدفونین پر بہت کام کیا ہے۔ ان کی اس موضوع پر کئی غیر مطبوعہ کتب کی تفصیل اس ویب سائٹ پر دستیاب ہے: http://www.andishvaran.com۔ ان میں سے ایک کتاب ہزار مزار ایران (فارسی) تیس جلدوں میں ہے۔

بخارا (ازبکستان): تاریخ بخارا (فارسی) از نرشخی کا دوسرا نام مزارات بخارا ہے۔ مطبوعہ

تاریخ ملا زادہ در ذکر مزارات بخارا (فارسی)، احمد بن محمود بخاری المدعو بمعین الفقراء، بہ اہتمام احمد گلچین معانی، تہران، ۱۳۳۹ش، بخارا اور اس کے نواح میں مدفون ۱۶۰ شخصیات کا تذکرہ ہے۔ ہر مزار کے محل وقوع کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۳۲۲ھ میں بخارا سے بھی طبع ہو چکی ہے۔

تحفۃ الزائرین (فارسی)، ناصر الدین حسینی حنفی بخاری (تصنیف ۱۳۲۴ھ)، بخارا، ۱۳۲۸ھ، سلسلہ خواجگان (خواجہ عبدالخالق غجدوانی سے لے کر سال تصنیف تک) کے مزارات و مقابر کا تذکرہ ہے۔

مناقب مزارات بخارائے شریف (مخطوطہ لنین گراڈ، شمارہ ۳۹۰) بحوالہ مقدمہ راشدی برمکلی نامہ۔

بلخ (افغانستان): تاریخ مدفونین وحالات سمرقند (تصنیف ۹۸۱ھ) بحوالہ مقدمہ راشدی برمکلی نامہ۔

تاریخ مزارات بلخ (فارسی) محمد صالح خان اوزبک (سال تصنیف ۱۰۰۶ھ) بحوالہ مقدمہ راشدی برمکلی نامہ۔

تاریخ مزار حضرت علیؓ، مولف نامعلوم، مخطوطہ مکتوبہ ۱۲۹۰ھ در کتب خانہ میاں مسعود احمد جھنڈیر، سردار پور جھنڈیر، تحصیل میلسی، نمبر نسخہ ۱۴۸۔

فضائل بلخ، اصل عربی تصنیف شیخ الاسلام صفی الملۃ والدین ابوبکر عبداللہ بن عمر بن محمد بن داود واعظ بلخی (ولادت تقریباً ۵۱۳ھ، حیات ۶۱۰ھ) کی تصنیف ہے۔اس کا فارسی ترجمہ عبداللہ بن محمد بن حسین حسینی بلخی نے ۶۷۶ھ میں کیا۔ یہ فارسی ترجمہ باہتمام عبدالحئی حبیبی، بنیاد فرہنگ ایران، تہران ۱۳۵۰ش شائع ہوا۔اس میں بلخ میں مدفون مشائخ اور علماء کا ذکر ہے۔

مزارات شہر بلخ (فارسی) از محمد بلخی، ۱۹۶۶ء

بہاول پور (پاکستان): مزارات اولیائے بہاول پور (اردو) احمد بدر اخلاق، لاہور، ۱۹۹۳ء، بہاول پور اور اس کے اطراف، اوچ، چشتیاں، احمد پور شرقیہ وغیرہ میں مدفون ۳۵ بزرگوں کا تذکرہ ہے۔

تذکرۂ ملوک شاہ (اردو)، محمد حسن خان میرانی نوشاہی بہاول پوری، بہاول پور ۱۹۹۶ء، بنیادی طور پر یہ ایک بزرگ سید ملوک شاہ قادری (م ۱۱۷۴ھ) کا تذکرہ ہے۔ یہ بزرگ بہاول پور میں جہاں دفن ہیں وہاں کا قبرستان انہیں کے نام سے منسوب ہے لہٰذا مصنف نے اس قبرستان کے مدفونین کا بھی طبقات کے لحاظ سے تذکرہ کردیا ہے۔

پاک پتن (پاکستان): مزارات اولیائے پاک پتن شریف (اردو)، احمد بدر اخلاق، لاہور، ۱۹۹۶، پاک پتن (پنجاب) میں مدفون ۳۷ بزرگوں کا تذکرہ ہے ۔بعض مزارات کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔

پاکستان: بلدالاولیاء، زیارات اولیائے پاکستان (تصویری البم)، افتخار احمد حافظ قادری، راول پنڈی، ۲۰۰۲ء، پاکستان میں واقع مزارات کی ۲۱۲ رنگین تصاویر پر مشتمل ہے۔ ہر تصویر کے

نیچے محل وقوع کی وضاحت کی گئی ہے۔

شہر خموشاں کے مکین، ایم آر شاہد، الفیصل لاہور، ۲۰۰۴ء، ۶۲۴ صفحات، اسلام آباد، راول پنڈی ڈویژن، مری، گوجر خان، جہلم، چکوال اور اٹک کے مدفونین کا تذکرہ ہے۔ اہم الواح مقابر بھی نقل ہوئے ہیں۔

میراث جاویدان (فارسی)، سید کمال حاج سید جوادی، پاکستان اور آزاد کشمیر کے کتبات بشمول مزارات کے کتبات پر مشتمل ہے۔ رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد نے ۹۲-۱۹۹۱ء میں با تصاویر دو جلدوں میں شائع کی۔

تاجکستان: مزارہای شمال تاجکستان و چہاردہ مزار (تاجکی) از حمزہ کمال (۲۰۰۱ء)۔

راقم السطور کی ذاتی اطلاع کے مطابق امریکی محققہ ڈاکٹر جوآن گروس آج کل تاجکستان کے مزارات پر تحقیق میں مصروف ہیں۔

تبریز (ایران) اور اطراف تبریز: تاریخ اولاد الاطہار (فارسی)، محمد رضا بن محمد صادق حسنی حسینی موسوی رضوی طباطبایی تبریزی، ۱۳۰۰ھ میں تالیف اور اسی سال تبریز سے شائع ہوئی۔

روضات الجنان و جنات الجنان (فارسی، سال تصنیف ۹۷۵ھ)، حافظ حسین کربلائی، بہ تصحیح میرزا جعفر سلطان القرایی، تہران، ۱۳۴۴ش، دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ تبریز اور اطراف تبریز میں مدفون شخصیات کا بہت عمدہ تذکرہ ہے۔

روضۃ الاطہار (فارسی، تاریخ تالیف ۱۰۱۱ھ)، محمد امین حشری تبریزی انصاری، روضہ اطہار کے نام سے بہ تصحیح عزیز دولت آبادی، تبریز، ۱۳۷۱ش میں چھپی ہے۔ اسی کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ اس سے پہلے مزارات تبریز پر ایک کتاب مزارات قبور (کذا) درویش حسین نے لکھی جو نامکمل تھی اور اب ضائع ہو چکی ہے۔

کوی سرخاب تبریز و مقبرۃ الشعرا (فارسی)، سید ضیاء الدین سجادی، تہران ۱۳۳۶شمسی، تبریز کے مضافات میں واقع کوے سرخاب (یا کوہ سرخاب) اور مقبرۃ الشعراء (جہاں قدیم دور کے شعراء کے مقبرے ہیں) کے مدفونین کا تذکرہ ہے۔

مزارات خوی (فارسی)، محمد الوان ساز خوی، تہران، ۱۳۹۰شمسی، تین ابواب میں خوی

(مضافات تبریز) میں مدفون امام زادوں، سادات اور دیگر مشاہیر کے موجود اور غیر موجود مزارات کا تذکرہ ہے۔ شمس تبریزی کا مزار بھی اسی شہر میں ہے۔

منظر الاولیاء (فارسی) از محمد کاظم بن محمد تبریزی ملقب بہ اسرار علی شاہ متخلص بہ اسرار (۱۲۶۵-تقریباً ۱۳۱۵ھ)، سال تالیف ۱۳۰۴اق، بہ تصحیح میر ہاشم محدث، تہران، ۲۰۰۹ء، تبریز اور گرد و نواح میں مدفون شخصیات کا تذکرہ ہے۔

ٹھٹھہ (پاکستان): تحفۃ الطاہرین (فارسی، سال تصنیف ۱۱۹۴ھ)، شیخ اعظم ٹھٹھوی، کراچی، سندھی ادبی بورڈ، بہ اہتمام بدر عالم درانی، ۱۹۵۶ء، ٹھٹھہ اور مکلی میں مدفونین کا تذکرہ ہے۔

سندھ کا شہر ٹھٹھہ شاہ جہانی مسجد اور مضافات میں واقع کوہ مکلی کے قبرستان میں مقبروں کے فن تعمیر اور خوش نویسی کے شاہپاروں کی وجہ سے مورخوں اور تذکرہ نویسوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر کتب کا تذکرہ ہمارا مقصد نہیں ہے لیکن محض یہ بتانے کے لیے کہ کسی مزار کے تذکرے کی کیا کیا جہات ہوسکتی ہیں، ایک دو کتابوں کا ذکر کردیا جاتا ہے:

Ahmad Hasan Dani: Thatta Islamic Architecture, Institute of Islamic history, Culture and Civilization, 1982.

M.A. Ghafur: The Calligraphers of Thatta, Institute of Central & West Asian Studies, University of Karachi, 1987 (first edition 1968).

حیدرآباد (سندھ): M. Siddique G. Memon: The tomb of the Kalhora Chiefs in Hyderabad, Oxford University Press, Karachi, 1994.۔ حیدرآباد میں کلہوڑا خاندان کے اکابر کے مزارات کا تذکرہ ہے۔

M. Siddique G. Memon: The tombs of Talpur Mirs, Insitute of Sindhology, Jamshoro, 1990۔ حیدرآباد اور نواح میں تالپور میروں کے مقابر کا تذکرہ ہے۔

حیدرآباد (دکن): حیدرآباد کی مشہور عبادت گاہیں، درگاہیں اور مذہبی عمارتیں (اردو)، شائع کردہ سررشتۂ معلومات عامہ سرکار حیدرآباد، ۱۳۵۲ فصلی، بحوالہ مقدمہ راشدی بر مکلی نامہ۔

مآثر دکن (اردو)، علی اصغر بلگرامی، حیدرآباد ۱۹۲۲ء، تجدید اشاعت: کراچی ۱۹۷۸ء،

حیدرآباد کی تاریخی عبارات، مزارات کے کتبات پر مشتمل ہے۔

خراسان (۲): خلد برین (فارسی) از والہ اصفہانی، ۱۳۷۸ش۔ مزارات خراسان (فارسی)، محمد کاظم شانہ چی، ۱۳۴۵ش

تیموری دور کے خراسان کے مقابر پر ڈاکٹر ہیلن برانڈ کی کتاب مقابر (فارسی ترجمہ کرامت اللہ افسر، تہران، ۱۹۸۸ء)۔

دہلی (ہندوستان): آثار الصنادید (اردو)، سرسید احمد خان، متعدد اشاعتیں، اولین اشاعت ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء، بعد کی ایک اشاعت کراچی، بہ اہتمام سید معین الحق، ۱۹۶۶ء، دہلی کی عمارات اور کتبات پر ہے۔

دہلی کی درگاہ شاہ مردان (اردو)، ڈاکٹر خلیق انجم۔

دہلی میں دفن خزینے (اردو)، عطاء الرحمٰن قاسمی، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

رسالہ سالار جنگ، مقابر دہلی کے حالات پر، بحوالہ مقدمہ راشدی برمکلی نامہ۔

سیر المنازل (فارسی)، مرزا سنگین بیگ (زمانہ تالیف ۱۸۲۷ء)، مرتبہ مع اردو ترجمہ شریف حسین قاسمی، دہلی، ۱۹۸۲ء، شاہ جہان آباد کی مختلف عمارات، مقابر کا تذکرہ ہے۔

کلمات الصادقین (فارسی)، محمد صادق دہلوی کشمیری ہمدانی، فارسی متن بہ تصحیح و ترتیب ڈاکٹر محمد سلیم اختر، اسلام آباد/لاہور، ۱۹۸۸ء، اردو ترجمہ از لطیف اللہ، کراچی، ۱۹۹۵ء، ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۴ء تک دہلی میں مدفون صوفیہ کا تذکرہ ہے۔

مرقع دہلی (فارسی)، درگاہ قلی خان، مرتبہ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۹۳ء، بنیادی طور پر یہ کتاب اٹھارہویں صدی عیسوی کی دہلی کی سماجی اور تہذیبی زندگی و رجال کا ایک ماخذ ہے۔ اس کے ابتدا میں دہلی کے چند اہم ترین مزارات اور درگاہوں کا بھی تذکرہ ہے۔

مزارات اولیائے دہلی (اردو)، محمد عالم شاہ فریدی دہلوی، طبع اول ۱۳۳۰ھ، طبع دوم ۱۳۴۶ھ، بحوالہ مقدمہ راشدی برمکلی نامہ۔

Savita Kumari, Tombs of Delhi: Sultanate period, Delhi, 2006۔

ڈھاکہ (بنگلہ دیش): آسودگان ڈھاکہ (اردو)، حکیم حبیب الرحمٰن، ڈھاکہ، ۱۹۴۶ء،

''ڈھاکہ اوراس کے ملحقات کے قبور مسلمین کے حالات'' (سرورق)۔

ڈیرہ غازی خان (پاکستان): مزارات اولیائے ڈیرہ غازی خان ڈویژن (اردو)، احمد بدر اخلاق، لاہور ۱۹۹۵ء، ۸۰ص، باتصویر، ۳۹ شخصیات کا تذکرہ ہے۔

سرگودھا (پاکستان): ''خفتگان خاک سرگودھا'' (پنجابی مقابلہ)، شاکر کنڈان، شش ماہی لیکھ، لاہور، جلد ۵، شمارہ ۱، جنوری تا جون ۲۰۱۰ء، صفحات ۴۵-۶۵۔

سمرقند (ازبکستان): بیان مزارات ولایت سمرقند وعدد مواضع آنہا، مصنف نامعلوم، قلمی نسخہ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، تاشقند (بحوالہ فہرست اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، جلد ا، ص ۳۰۳)۔

سمریہ (یا: ثمریہ) (فارسی)، ابوطاہر بن قاضی ابوسعید سمرقندی، ()، بہ اہتمام ایرج افشار، تہران، ۱۳۶۷ شمسی (طبع دوم)، سمرقند کے جغرافیے اور عمارات پر مختصر رسالہ ہے، اس کا باب نہم مزارات پر ہے۔

قندیہ (فارسی)، سمرقند کے مزارات کی تاریخ اور مدفونین کا تذکرہ ہے۔ اس کا انتخاب قندیہ خرد کے نام سے موجود ہے۔ قندیہ، محمد بن عبدالجلیل سمرقندی کی تصنیف ہے۔ اس کی بنیاد پر اور کچھ دیگر مآخذ کو سامنے رکھ کر ملا عبدالحکیم تاجر کتب نے جو قندیہ تیار کیا اسے خود ہی ۱۹۰۹ء میں سمرقند سے چھاپا، ایرانی محقق ایرج افشار نے اسی قندیہ کو محمد بن عبدالجلیل کی تصنیف کے طور پر، تہران سے ۱۳۶۷ شمسی (طبع دوم) میں شائع کیا۔

قندیہ (فارسی)، عبدالملک بن حیدر سمرقندی، ۱۹۵۷ء۔

سندھ (پاکستان): صنادید سندھ، مولوی محمد شفیع، مرتبہ احمد ربانی، لاہور ۱۹۷۰ء۔

پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے سندھ کے تین تحقیقی دوروں کے بعد لکھے۔ انہوں نے دسمبر ۱۹۳۴ء میں گیجے، مکلی، ٹھٹھہ، سہون اور سکھر، مارچ ۱۹۳۷ء میں بھکر، روہڑی اور الور اور بعد ازاں منگھو پیر اور بلوچی مقابر کے تحقیقی دورے کیے، ان تینوں اسفار میں انہوں نے جو تاریخی کتبے دیکھے اور نقل کیے ان پر مضامین و مقالات تحریر کیے اور اورینٹل کالج میگزین میں شائع کیے۔ مولوی صاحب کے صاحب زادے احمد ربانی نے ۱۹۶۹ء میں ان تمام مقامات کا دورہ کیا اور ان مزارات اور کتبوں کی تصاویر بنائیں جن کو ان کے والد گرامی

نے اپنے مقالات میں شامل کیا تھا۔ پھر احمد ربانی نے ان مقالات اور تصاویر کو جمع کیا اور صنادید سندھ (باتصویر) کے نام کتابی شکل میں شائع کیا۔ مولوی صاحب نے ان شہروں میں تاریخی مزارات اور دیگر اہم عمارات مثلاً مساجد پر نصب کتبوں کو نقل کیا۔ زیادہ تر کتبے فارسی اور کچھ عربی میں ہیں۔ ٹھٹھہ میں جامع مسجد ٹھٹھہ، مسجد مظفر خان، خانقاہ بوترابی، سہون میں قلعہ، سہون میں خانقاہ مخدوم لعل شہباز قلندر، دیندار خان کے لگائے ہوئے خانقاہ سہون کے کتبے، سلطان محمد تغلق کی قبر کی نشاندہی اور سہون کے مختلف مقابر کے کتبے۔ میر معصوم بھکری اور ان کے والد میر صفائی اور ان کے خاندان کی قبروں کے کتبات، میر ابوالقاسم کی قبر کے کتبے اور منگھو پیر کراچی میں موجود مختلف کتبے شامل ہیں۔

Henry Cousens, The Antiquities of Sindh, Calcutta, 1929, reprint: Karachi, 1975۔

زیرین سندھ بالخصوص ٹھٹھہ اور کراچی اضلاع اور ضلع لس بیلہ (بلوچستان) میں مخصوص طرز کے مقبرے ہیں جن کا گنبد چار یا چار سے زائد ستونوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ انہیں ''چوکھنڈی'' مقبرہ کہا جاتا ہے۔ اس خاص طرز تعمیر کے مقبروں پر مستقل کتب لکھی گئی ہیں، جیسے:

Ali Ahmed Brohi: History on tombstones: Sindh and Baluchistan, Baluchistan, (Chaukhandi funerary art). Sindhi Adabi Board, 1986.

Salome Zajadac-Hastenrath: Chaukhandi Tombs (Funerary Art in Sindh and Baluchistan), Translated by Michael Robertson Oxford University Press Karachi, 2003.

پہلے یہ کتاب ۱۹۷۸ء میں Wiesbaden جرمنی سے چھپی تھی۔

Sheikh Khurshid Hasan: Chaukhandi Tombs in Pakistan Royal book company, Karachi 1996 .

Sheikh Khurshid Hasan: The Islamic Architectural Heritage of Pakistan (Funerary Memorial Architecure), Royal Book Company,

Karachi 2001.

اس کتاب کا آٹھواں باب سمہ مقبروں، نواں باب ترخان مقبروں، سترہواں باب تالپور مقبروں کے بارے میں ہے۔

سیرام (قزاقستان): Mir Ahmad Mir Khaldar ogli, Sayramliq Allama Fuzala Buzurglar, Chimkent 1994. (in Uzbek language and krilic/Russian alphabet). This book contains information about sufis and ulama (scholars) lived, died and buried in Sayram city of Kazaqistan.

شیراز (ایران): دستور الزائرین (فارسی)، عبدالعزیز بن محمد المدعو بہ افضل شیرازی۔ شیراز میں مدفون مشائخ، اکابر، علماء کا تذکرہ ہے۔ مصنف نے ہزار مزار سے استفادہ کیا ہے۔ (کشف الظنون، ج ۱، ص ۷۵۴)

شدالازار فی حط الاوزار عن زوار المزار (عربی)، معین الدین ابی القاسم جنید بن محمود بن محمد عمری شیرازی (آٹھویں صدی ہجری)، بہ اہتمام محمد قزوینی و عباس اقبال، تہران، ۱۹۴۹ء، شیراز میں مدفون ۳۱۵ بزرگوں کا اہم تذکرہ ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ مصنف کے بیٹے، عیسی بن جنید شیرازی نے ۷۹۱ھ میں کیا اور اس کا نام ملتمس الاحباء خالصاً من الریاء رکھا جو تذکرۂ ہزار مزار کے نام سے شیراز سے بہ اہتمام عبدالوہاب نورانی وصال، ۱۳۶۴ش چھپا۔ اس سے پہلے یہ ۱۳۲۰ش میں شیراز ہی سے چھپا تھا۔

غزنی/غزنہ/غزنین (افغانستان): ریاض الالواح (فارسی)، شیخ محمد رضا، کابل، ۱۹۶۷ء، یہ کتاب غزنہ کے مزارات اور تاریخی عمارتوں کے کتبات کی نقول پر مشتمل ہے۔

رسالہ مزارات غزنین (فارسی)، علی احمد نعیمی (م: ۱۹۷۰ء)۔

قصور (پاکستان): مزارات اولیائے قصور (اردو)، احمد بدر اخلاق، لاہور، ۱۹۹۶ء، قصور میں مدفون بزرگوں کا تذکرہ ہے اور ان کے مزارات کی موجودہ کیفیت بھی بیان کی گئی ہے۔

قم (ایران): تربت پاکان قم: شرح حال مدفونین در سرزمین قم (فارسی)، از عبدالحسین

جواہر کلام، قم ۱۳۸۲ش ر۲۰۰۴ء، قم میں مدفون لوگوں کا تذکرہ ہے۔ تاحال چار جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

کابل (افغانستان): مزارات کابل (فارسی)، محمد ابراہیم خلیل، کابل، ۱۳۳۹ش (طبع اول)؛ پشاور، ۱۳۷۵ش (طبع دوم، مزارات شہر کابل کے نام سے شائع ہوئی)، کابل اور اس کے مضافات میں واقع مزارات اور مدفونین کا تذکرہ ہے۔ مصنف نے الواح مزار نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

کراچی (پاکستان): خفتگان کراچی (اردو)، محمد اسلم، لاہور، ۱۹۹۱ء، کراچی میں واقع قبرستانوں کی ترتیب سے، قبور کا محل وقوع، الواح مزار اور صاحب مزار کا تذکرہ ہے۔

کرمان (ایران): تذکرۃ الاولیاء یا مزارات کرمان (فارسی)، محرابی کرمانی، تہران، ۱۳۳۰ش۔

گجرات (پاکستان): خفتگان خاک گجرات (اردو)، محمد منیر احمد سلیچ، گجرات، ۱۹۹۶ء گجرات، پنجاب اور اس کے مضافات میں واقع مدفونین کا تذکرہ اور الواح قبور کو نقل کیا گیا ہے۔

گلبرگہ (ہندوستان): ارمغان سلطانی، سیر گلبرگہ (اردو)، مولوی محمد سلطان، مطبوعہ ۱۳۴۳ھ، گلبرگہ کے مقابر کے حالات پر ہے، (بحوالہ مقدمہ راشدی برمکلی نامہ)۔

گوروپانڈہ (ہندوستان): احوال گوروپانڈہ (اردو)، منشی شیام پرشاد، گوروپانڈہ میں قبروں اور دیگر تاریخی آثار کے حالات۔

لاہور (پاکستان): تحقیقات چشتی (اردو)، مولوی نور احمد چشتی، لاہور، پنجابی ادبی اکادمی، بہ اہتمام سید احسان علی، ۱۹۶۴ء، اس کتاب میں لاہور و نواح لاہور کی عمارات، مزارات، مقابر اور مساجد کا حال ہے۔

حضرت ایشان اور ان کا قرب و جوار (اردو)، احمد بدر اخلاق، لاہور، ۱۹۹۷ء، خواجہ خاوند محمود المعروف حضرت ایشان کے مزار واقع لاہور اور اس کے قرب و جوار میں مدفونین کا تذکرہ ہے۔

خفتگان خاک لاہور (اردو)، محمد اسلم، لاہور، ۱۹۹۳ء، لاہور کے گورستانوں کی ترتیب سے وہاں واقع قبروں کا تذکرہ ہے۔ الواح مزارات نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور صاحب

مزار کا مختصر تعارف لکھا گیا ہے۔

لاہور میں دفن خزینے (اردو)، حمیرا ہاشمی، محمد اسلم انصاری، ممتاز حسین نعیم، لاہور، ۱۹۹۸ء۔

لاہور میں مدفون مشاہیر (اردو)، جلد دوم، ایم آر شاہد، لاہور، ۲۰۰۸ء۔

لاہور میں مدفون ہندو، سکھ، مسیحی شخصیات (اردو)، راو جاوید اقبال، لاہور، ۲۰۰۹ء۔

لاہور میں مشاہیر کے مدفون [کذا] (اردو)، ایم آر شاہد، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

مزارات اولیائے لاہور (اردو) حصہ اول، احمد بدر اخلاق، لاہور ۱۹۹۵ء، سلاسل تصوف سے وابستگی کے اعتبار سے لاہور میں مدفون قادریہ، نقش بندیہ، سہروردیہ، چشتیہ اور متفرق بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ ہر مزار کا محل وقوع بتایا گیا ہے۔

مدینہ منورہ (سعودی عرب): مدینۃ النبی کی تاریخ پر جو کتب لکھی گئی ہیں ان میں جنت البقیع کی تاریخ اور وہاں مدفونین کا ضرور ذکر ملتا ہے۔ ان تمام کتب کا احصا یہاں ممکن نہیں ہے۔ چند ایک کتب کا تبرکاً ذکر کیا جاتا ہے۔

تاریخ جنت البقیع (اردو)، حسن رضا غدیری، ادارہ منہاج الصالحین، لاہور، ۲۰۴ص۔

فضائل مدینۃ المنورہ (عربی)، خلیل ابراہیم ملا خاطر، جدہ، ۱۴۰۹ھ، چوتھے باب میں مدینہ کے مزارات کا ذکر ہے۔

قبور ائمہ البقیع قبل تہدیمہا (عربی)، عبدالحسین سید حبیب الحیدری الموسوی، دارالسلام بیروت، ۱۴۰۹ھ/۱۹۹۸ء، جنت البقیع کے انہدام سے قبل وہاں ائمہ کی قبور کے حالات مع ائمہ کے حالات۔

جنت البقیع میں مدفون دیوبندی علماء کے اسماء کی فہرست کے لیے دیکھیے: ماہنامہ بینات، کراچی، نومبر ۲۰۰۸ء، ج ۷۱، شمارہ ۱۱۔

مراغہ (ایران): مزارات، سنگ نوشتہ و اسناد مراغہ (فارسی)، یوسف بیگ بابا پور، قم ۱۳۸۸ش/ ۲۰۰۹ء، ایرانی صوبے آذربائیجان شرقی کے تاریخی شہر مراغہ کے مزارات کی کتبوں اور دستاویزات کے بارے میں ہے۔

مزارشریف (افغانستان): نیز دیکھیے: بلخ۔ تاریخ مزارشریف (فارسی)، حافظ نور محمد، ۱۹۹۰ء۔

مشہد (ایران): مشاہیر مدفون درحرم رضوی، مرتبہ گروہ تراجم وانساب بنیاد پژوہش ہای اسلامی، زیر نگرانی غلام رضا جلالی، بنیاد پژوہش ہای اسلامی، مشہد، ۱۳۸۷ش/۲۰۰۸ء، طبع اول، امام رضا، مشہد کے مزار کے جوار میں مدفون مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ پہلی دو جلدوں میں ۱۲۶۰ مشاہیر کا تذکرہ ہے۔

اسی کتاب کی تلخیص ابراہیم زنگنہ قاسم آبادی نے گزیدۂ مشاہیر مدفون درحرم رضوی کے نام سے کی ہے، بنیاد پژوہش ہای اسلامی، مشہد، ۱۳۸۷ش/۲۰۰۸ء طبع ہفتم۔ اس تلخیص میں ۵۷ مشاہیر کا تذکرہ ہے۔

مکلی (مضافات ٹھٹھہ، پاکستان): نیز دیکھیے: ٹھٹھہ۔

مکلی نامہ (فارسی)، میر علی شیر قانع ٹھٹھوی (سال تصنیف ۱۱۷۴ھ)، مقدمہ، حواشی، تعلیقات سید حسام الدین راشدی، حیدرآباد/کراچی، طبع اول ۱۹۶۷ء، طبع دوم ۱۹۹۴ء، کوہ مکلی پر واقع مزارات کا احوال ہے۔ اس کے مقدمہ میں راشدی نے مزارات اور شہروں کے حوالے سے مزارات کے تذکروں میں سے ۲۶ عربی، ۱۴۰ فارسی اور ۱۴ ہندوستان میں تصنیف ہونے والی فارسی اردو تصانیف کا علاحدہ ذکر کیا ہے۔

Ihsan H. Nadeem: Makli, The necropolis at Thatta, Sang e Meel Publication, Lahore, 2000.

Suhail Zaheer Lari and Yasmeen Lari: The Jewel of Sindh (Samma monuments on Makli hills), Oxford University Press Karachi, 1997.

کوہ مکلی پر سمہ دور کے مقابر کا فن تعمیر کے لحاظ سے تذکرہ ہے۔

مکۃ المکرّمہ (سعودی عرب)

جنت المعلی میں مدفون دیوبندی علماء کے اسماء کی فہرست کے لیے دیکھیے: ماہنامہ بینات، کراچی، نومبر ۲۰۰۸ء، ج ۷۱، شمارہ ۱۱۔

نسف (ازبکستان): Nasir Muhammad, Nasaf va Kesh Allama Lari, Tashkent 2006. (in Uzbek language). This book contains information about lives of scholars lived and buried in Nasaf and Kesh cities of Uzbekistan.

ہرات (افغانستان): آثار ہرات (فارسی)، خلیل اللہ خلیلی، تہران، ۲۰۰۴ء، ہرات کے رجال، مزارات اور عمارات کا تذکرہ ہے۔

خیابان (فارسی)، فکری سلجوقی، کابل، ۱۳۴۳ش، ہرات کے شمال میں کوہ مختار کے دامن میں واقع علاقہ خیابان کہلاتا ہے، جہاں کئی مشاہیر کے مزارات اور دیگر تاریخی عمارات ہیں۔ یہ کتاب ان ہی عمارات اور مزارات کا تذکرہ ہے۔ مصنف نے الواح و کتبات نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے اور تصاویر بھی شامل کی ہیں۔

گازرگاہ (فارسی)، گازرگاہ ہرات کے مضافات میں واقع ہے جہاں شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کے مزار اور اس سے ملحقہ قبرستان میں کئی مشاہیر اسلام دفن ہیں۔

رسالہ مزارات ہرات (فارسی)، بہ تصحیح و حواشی فکری سلجوقی، کابل، ۱۹۶۷ء، اس مجموعہ میں تین رسالے ہیں: رسالہ اول مقصد الاقبال سلطانیہ، اصیل الدین واعظ ہروی؛ رسالہ دوم تالیف عبیداللہ بن ابوسعید ہروی؛ رسالہ سوم تالیف اخندزادہ ملا محمد صدیق ہروی۔ ہرات کے مزارات کا تذکرہ ہے۔ الواح قبور بھی نقل کی گئی ہیں اور ان کی تعمیر کی تاریخ بتائی گئی ہے۔ الواح اور قبور کی تصاویر بھی ہیں۔

مقصد الاقبال سلطانیہ و مرصد الآمال خاقانیہ (فارسی)، سید اصیل الدین عبداللہ واعظ، بکوشش مایل ہروی، تہران، ۱۳۵۱ش، مرتب نے اس میں عبیداللہ بن ابوسعید ہروی کا رسالہ مزارات ہرات بھی بطور تعلیق شامل کیا ہے۔ پہلا رسالہ سلطان ابوسعید گورگانی کے حکم کے مطابق تقریباً ۸۶۳-۸۷۳ھ کے درمیان تصنیف ہوا اور دوسرا رسالہ ۱۱۹۸ھ میں لکھا گیا۔ دونوں رسالوں میں ہرات اور اس کے نواح میں مدفون بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ ہر مزار کا محل وقوع بتایا گیا ہے۔

ہندوستان: تاریخ و عمارۃ المزارات والاضرحۃ الاثریۃ الاسلامیۃ فی الہند (عربی)، احمد

رجب محمد علی ، الدارۃ المصریۃ اللبنانیۃ ، ۲۰۰۵ء ،۲۹۲ صفحات ، ہندوستان میں قدیم اسلامی مزارات اور ضریحوں کی تاریخوں اور فن تعمیر کے بارے میں ہے۔

حواشی

(۱) ''اسلامی ادب میں وفیات نویسی کی روایت'' طبع اول بہ طور مقدمہ، وفیات ناموران پاکستان از منیر احمد سلیچ، لاہور، ۲۰۰۶ء، طبع دوم: مجلّہ اسلامی تاریخ و ثقافت، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی، شمارہ ۱، ۲۰۰۷ء، ص ۴۹-۷۰، طبع ثالث نظر ثانی کے بعد: مطالعات، دہلی، جلد ۳، شمارہ ۳، مسلسل شمارہ ۸ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء، رجب تا رمضان ۱۴۲۹ھ، ص ۱۴۵-۱۶۳؛ طبع چہارم مزید اضافات کے ساتھ، بطور مقدمہ، تذکرہ معاصرین، مالک رام، الفتح پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۰ء۔ (۲) قدیم دور میں ایران کا وسیع علاقہ جس میں افغانستان کا مغربی حصہ بھی شامل تھا۔ اسے تاریخ میں خراسان بزرگ بھی کہا جاتا ہے۔ موجودہ خراسان، ایران کا ایک صوبہ ہے جس کا مرکز مشہد رضوی ہے۔

ہندوستان میں مولانا روم کی مقبولیت

شریف حسین قاسمی

مولانا روم کو بجا طور پر ہمارے مفاخر میں شمار کیا جاتا ہے۔ شروع ہی سے انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ بادشاہوں اور عوام نے ان سے محبت کی ہے۔ اپنوں اور غیروں نے ان کی بات سنی، یہ صورت حال آج بھی برقرار ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کے اس پہلو کو زیادہ اجاگر کیا جو انسان دوستی کے جذبات کی ترجمانی اور ہر طرح کے امتیاز کے بغیر بنی نوع انسان کی بھلائی پر زور دیتا ہے۔ سماج کے کمزور طبقے کے حق میں آواز اٹھانا، مولانا اور ان کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک آمرانہ حکومتوں کے دور میں محض خواب و خیال تھا۔ مولانا نے یہ کام بھی نہایت سنجیدگی اور خلوص نیت سے انجام دیا کہ یہ خود اسلام کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ مولانا نے صاحبان اقتدار کو یاد دلایا:

اسپ ہمت سوی اختر تاختی آدم مسجود را نشناختی

(آسمان کو فتح کرنے کے لیے گھوڑے دوڑا رہے ہو، افسوس یہ ہے کہ تم نے دنیا کے کمزوروں کو نہیں پہچانا، ان کی طرف توجہ نہیں کی، یہ تو اصل کام ہے)۔

مولانا کے اس رویے نے انہیں عوام الناس میں محبوب بنا دیا۔ عام انسان انہیں دربار خداوندی میں اپنا نمایندہ سمجھتا اور ان کے گن گاتا تھا۔

مولانا روم کی مثنوی ہو یا غزلیات، ان کے فکر کی بنیاد عشق و محبت پر استوار ہے۔ یہ عشق خدا سے ہے، اس کی مخلوق سے ہے۔ عشق مولانا کے لیے ''طبیب جملہ علت ہا'' (تمام بیماریوں کا علاج) ہے۔

دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

شاد باش ای عشق خوش سودای ما   ای طبیب جملہ علتہای ما
ای علاج نخوت و ناموس ما   ای تو افلاطون و جالینوس ما

وہ عشق اور محبت کو ہر انسانی مرض کا علاج سمجھتے ہیں۔انہوں نے عشق و محبت کے گوناگوں فوائد گنائے ہیں:

از محبت تلخہا شیرین شود   از محبت مسّہا زرین شود
از محبت دردھا صافی شود   و زمحبت دردھا شافی شود
از محبت خارھا گل می شود   و زمحبت سرکہا مل می شود
از محبت نار نوری می شود   و زمحبت دیو حوری می شود
از محبت سنگ روغن می شود   بی محبت موم آھن می شود
از محبت حزن شادی می شود   و زمحبت غول ہادی می شود
از محبت نیش نو شی می شود   او زمحبت شیر موشی می شود
از محبت سقم صحت می شود   و زمحبت قہر رحمت می شود
از محبت مردہ زندہ می شود   و زمحبت شاہ بندہ می شود

محبت سے کڑواہٹیں،مٹھاس میں بدل جاتی ہیں،معمولی دھات سونا ہوجاتی ہے۔
تلچھٹ کی آلودگیاں رفع ہوجاتی ہیں،بیماریوں کا علاج ہوجاتا ہے۔
کانٹے پھول بن جاتے ہیں،سرکہ شہد بن جاتا ہے۔
آگ نور میں تبدیل ہوجاتی ہے،دیوحور بن جاتا ہے۔
پتھر تیل ہوجاتا ہے،اوراگر محبت نہ ہوتو موم بھی لوہا ہوجاتا ہے۔
محبت سے رنج خوشی میں بدل جاتا ہے،محبت سے گمراہ ہادی بن جاتے ہیں۔
ناگوار چیزیں گوارا ہوجاتی ہیں،شیر چوہا بن جاتا ہے۔
محبت بیماریوں کا علاج ہے،قہر رحمت میں بدل دیتی ہے۔
مردہ کو زندہ کردیتی ہے،اور بادشاہ کو غلام بنادیتی ہے۔

مولانا نے اپنی سرگذشت میں صراحت سے اقرار کیا ہے کہ: میں تو مرچکا تھا، زندہ

ہوگیا، میں تو ماتم کرتا رہتا تھا، اب ہنس بولنے لگا۔ یہ سب دولت عشق کا کرشمہ ہے۔ یہ عشق، ابدی سعادت ہے جو مجھے نصیب ہوگئی۔

مردہ بدم زندہ شدم، گریہ بدم خندہ شدم   دولت عشق آمد و من دولت پایندہ شدم

مولانا نے اپنی مثنوی میں ہندوستانی مآخذ سے مفصل استفادہ کیا ہے۔ پنچ تنتر اور جاتکا کی کہانیوں نے مولانا کے عقائد وافکار کے بیان میں ان کا ساتھ دیا ہے۔ مولانا نے ان کہانیوں سے نہایت دقیق عرفانی نتائج اخذ کیے ہیں۔ طوطی و بازرگان کی داستان میں تو یہ اشارہ ملتا ہے کہ مولانا یہ تسلیم کرتے تھے کہ نجات کا راستہ ہندوستان سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں بھی مولانا اوران کی مثنوی کا خاطر خواہ استقبال کیا گیا۔ مختلف نسخوں کی بنیاد پر اس کو مرتب کیا گیا۔ اس پر شرحیں لکھی گئی ہیں، اس کے انتخاب تیار کیے گئے، فرہنگیں لکھی گئی، اس کی پیروی میں مثنویاں کہی گئیں اور حد تو یہ ہے کہ اس خیال سے کہ مولانا مثنوی مکمل نہیں کرسکے، اس پر ساتویں دفتر کا اضافہ کیا گیا۔

ایران کے ایک معروف ناقد وادبی مورخ عبدالحسین زرین کوب نے اپنی کتاب ''سرنی'' میں تجزیہ کیا ہے کہ:

''ایشیائے صغیر اور ایران میں مولانا کا نام اور کام رفتہ رفتہ مشہور ہوا۔ قونیہ میں مولانا سے وابستہ حلقۂ افراد کے باہر مولانا وفات کے بعد زیادہ معروف نہیں ہوئے۔ ایک مدت کے بعد مولانا کے نام لیواؤں نے یہ ارادہ کیا کہ مولانا اوران کی مثنوی کو باہر کی دنیا میں متعارف کرایا جائے۔ خود ایران میں نویں صدی ہجری تک ہمیں مولانا اوران کی مثنوی کا ذکر، شعراء اور دیگر لکھنے والوں کی تصانیف میں واضح طور پر نظر نہیں آتا۔ اگرچہ علاء الدولہ سمنانی کے رسالہ اقبالیہ، خواجو کرمانی، حافظ اور شاہ نعمت اللہ کے کلام میں مولانا کے افکار کی گونج سنائی دیتی ہے، لیکن نویں صدی ہجری میں ہرات کے ادبی مکتب کے وجود میں آنے کے بعد، مولانا اوران کی مثنوی کا نام ابہام کے پردے سے باہر آتا ہے۔ اس کے بعد دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں بے شمار ایرانی شاعروں

کے ہندوستان منتقل ہونے کے ساتھ، ہندوستان کے فارسی گوشعراء نے مولانا کو پہچانا، ان کی ستایش کی اور صاحبان ذوق نے ان کی مثنوی پر شرحیں لکھیں''۔

زرین کوب کے اس تجزیے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان میں مولانا کی مثنوی مغل دور میں متعارف ہوئی، لیکن یہ خیال درست نہیں۔ ہاں اتنا صحیح ہے کہ مغل دور میں مثنوی معنوی پر بہت کام کیا گیا، نئے نئے زاویوں سے کام ہوا اور بعض کام تو ہندوستان میں ایسے ہوئے جن کی مثال خود قونیہ اور ایران میں مشکل سے ملے گی۔

بوعلی شاہ قلندر وہ صوفی صافی ہیں جو تعارف کے محتاج نہیں۔ پانی پت میں ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔ ایک روایت کے مطابق متعدد دیگر عرفا کی طرح، انہوں نے بھی کسب فیض کی خاطر عالم اسلام کا سفر کیا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ قونیہ بھی گئے تھے اور مولانا جلال الدین رومی اور ان کے مرشد شمس تبریزی سے ملے تھے۔ ان کی وفات ۱۳۲۳ء میں ہوئی اور مولانا روم ۱۲۷۳ء میں واصل بہ حق ہوئے۔ اس کے معنی ہوئے کہ مولانا رومی اور بوعلی شاہ قلندر ایک دوسرے کے معاصر ہیں اور ان کی آپس میں ملاقات خارج از امکان نہیں۔ بوعلی شاہ قلندر کی چند تصانیف آج بھی دستیاب ہیں۔ ان میں دو مثنویاں بھی ہیں۔ ایک کنز الاسرار اور دوسری گل وبلبل، گل و بلبل مولانا کی مثنوی کی بحر رمل مسدس مقصور (فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن) میں کہی گئی ہے اور اس کے درج ذیل اشعار اس حقیقت کے غماز ہیں کہ یہ مثنوی نظم کرتے وقت بوعلی شاہ قلندر نے مولانا کی مثنوی کو اپنے سامنے رکھا تھا۔

مولوی فرمود نشنیدی مگر سنگ گرمی بود، می کردی اثر
ای کمان و تیرھا بر ساختہ صید نزدیک و تو دور انداختہ
ہرکہ دور انداز تر او دور تر و زچنین گنج است او مہجور تر

اس کے یہ معنی ہوئے کہ مولانا اور ان کی مثنوی خود ان کی زندگی ہی میں ہندوستان میں متعارف ہو چکی تھی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کے مستقر قونیہ کے باہر، ہندوستان میں سب سے پہلے ان کی مثنوی کو ہمارے ایک عارف نے اپنے عرفانی افکار کے بیان کرنے کے لیے نمونہ قرار دیا۔

بوعلی شاہ قلندر کے تھوڑے ہی عرصے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے خلیفۂ ارشد

شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے جو ۱۸ / رمضان ۷۵۷ / ۱۴ / ستمبر ۱۳۵۶ میں واصل بہ حق ہوئے، مثنوی سے استفادہ کیا تھا۔ خیر المجالس ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے قناعت، صبر اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے کی اہمیت پر گفتگو کے دوران مولانا روم کی مثنوی سے یہ ابیات نقل کی ہیں:

گفت پیغمبر کہ جنت از الٰہ گر ہمی خواہی زکس چیزی مخواہ

ور نخواہی، ضامنم پس مر ترا جنت الماوی و دیدار خدا

تصوف میں وحدت الوجود کے مسئلہ کی اہمیت سے سب واقف ہیں۔ کم عرفا ایسے ہیں جنہوں نے اس تصور کی تائید وتصدیق نہ کی ہو۔ اس موضوع پر عرفا اور دانش مندوں نے تقریباً ہر دور میں کتابیں لکھی ہیں اور ابن العربی کی حمایت کی ہے۔ ظاہر ہے مثنوی معنوی میں بھی یہ موضوع زیر بحث آیا ہے اور مولانا روم نے اس کی تائید کی ہے۔ چشتی سلسلے کے ایک معروف بزرگ گیسودراز نے جو شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ بھی ہیں، اپنے مکتوبات میں اس عقیدے کی تردید کی ہے۔ انہوں نے ابن العربی، عطار اور مولانا رومی کے اس نوعیت کے عقائد پر سخت اعتراض کیا ہے اور انہیں فریب اور اسلام دشمن قرار دیا ہے۔

وحدت الوجود سے متعلق یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے، ہمیں تو یہ بتانا ہے کہ مولانا کی زندگی اور اس کے فوری بعد آٹھویں صدی ہجری میں ان کی شخصیت اور مثنوی کی گونج ہندوستان کے عرفا کی مجالس وتصنیفات میں سنائی دیتی رہی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، مغل دور میں مثنوی پر ہندوستان میں نہایت اہم، بنیادی اور قابل توجہ کام انجام دیا گیا۔ اس دور میں تو مثنوی، بقول حافظ سید محمد علی خیر آبادی (ولادت ۱۱۹۲/ ۹-۱۷۷۸) غیر مسلموں میں بھی مقبول تھی۔

مولانا کے بیٹے سلطان ولد اور ان کے ایک مرید احمد رومی نے مثنوی کے مشکل مقامات کی شرح لکھی تھی۔ اس کے بعد نویں صدی تک اس ضمن میں کوئی اہم کام انجام نہیں دیا گیا۔ مکتب ہرات کے نمایندہ شاعر و ادیب ملا عبدالرحمٰن جامی (م ۸۵۱) اور ملا یعقوب چرخی (م ۸۵۱) نے مثنوی کے آغاز کے حصے کی شرحیں لکھیں۔ جامی کی شرح منظوم اور خود مثنوی کے وزن میں ہے۔ اسی ادبی مکتب کے ایک نمایندے ملا حسین واعظ کاشفی نے لب لباب مثنوی لکھی اور درحقیقت مثنوی کو

سمجھنے کا طریقہ بتایا لیکن اسے مثنوی کی تفسیر نہیں کہا جا سکتا۔ کمال الدین حسین خوارزمی (م ۸۴۰ھ) نے مثنوی کے تین دفتروں کی شرح لکھی جس کا نام جواہر الاسرار وزواہر الانوار ہے۔ انہوں نے مثنوی پر کنوز الحقایق نام سے منظوم شرح بھی لکھی ہے۔ اس کے بعد صفوی دور کا ایران مولانا کے افکار کی اشاعت کے لیے سازگار نہ تھا۔ لیکن ایشیائے صغیر اور ہندوستان میں مثنوی پر ادبی محفلوں میں برابر اور باقاعدگی کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی۔

مولانا کی مثنوی اور ان کے دیوان شمس سے متعلق جو کام مغل دور میں ہندوستان میں انجام دیا گیا، یہ مختصر مقالہ اس کی تفصیل کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلے میں مختصراً یہ عرض کر دیا جائے کہ ہندوستان میں:

۱۳۱ ایسی شرحیں موجود ہیں جو فارسی میں لکھی گئیں اور ان کے لکھنے والوں کے نام معلوم ہیں۔

۱۹ ایسی شرحوں کے خطی نسخے بھی کتاب خانوں میں محفوظ ہیں جن کے مصنّفین کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔

فارسی کی ان شرحوں کے علاوہ پشتو، اردو وغیرہ میں ۳۲ شرحیں ملتی ہیں۔

۱۴ شعراء نے مثنوی کی پیروی اور اسی کے وزن پر مثنویاں لکھی ہیں۔

مثنوی کے ۱۹ انتخاب موجود ہیں۔

مثنوی کی دو فرہنگیں دستیاب ہیں۔

مثنوی کی حکایات پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔

مثنوی میں وارد احادیث پر کام ہوا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہاں مثنوی کا دفتر ہفتم بھی نظم کیا گیا ہے، جو موجود ہے۔

یہ تو اجمالی گزارش تھی، اسی ضمن میں چند دیگر امور کا ذکر لازمی ہے۔

ہندوستان میں گیارہویں صدی ہجری میں عبداللطیف گجراتی (م ۱۰۴۸/۹-۱۶۳۸) کو سب سے عظیم مثنوی شناس سمجھنا چاہیے۔ انہیں مثنوی سے خاص شغف تھا۔ انہوں نے مثنوی کے مشکل اشعار کی شرح لکھی جو لطائف معنوی کے نام سے معروف ہے۔ مثنوی کی فرہنگ لکھی جو لطائف اللغات کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ مزید برآں، ان کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں

نے مثنوی کا ایک تنقیدی متن بھی تیار کیا جو تقریباً ۵۰ نسخوں پر مبنی ہے۔ یہ متن نسخہ ناسخہ مثنوی کے نام سے آج بھی چند کتاب خانوں کی زینت ہے اور غالباً کیا، یقینی طور پر مثنوی کو باقاعدہ مرتب کرنے کی یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے جو ہندوستان میں کی گئی اور ہمارے لیے قابل فخر ہے۔ اس کے علاوہ خواجہ ایوب لاہوری کی اسرار الغیوب، ولی محمد اکبرآبادی کی شرح مثنوی اور بحرالعلوم عبدالعلی لکھنوی کی شرحیں اس لیے بھی قابل ذکر ہیں کہ مولانا پر اہم کام انجام دینے والوں نے وہ خواہ ہندوستان میں ہوں خواہ ایران وغیرہ میں، ان شرحوں سے استفادہ کیا ہے۔

اس وقت علامہ شبلی کی ''سوانح مولانا روم'' کا ذکر بھی ضروری ہے اور یہ اس وجہ سے کہ اب تک مثنوی کے بارے میں جن کتابوں کا ذکر ہوا، ان میں بحرالعلوم کی شرح کو چھوڑ کر باقی سب عرفانی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ علامہ شبلی نے مثنوی کا علم کلام کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے۔ حضرت علامہ سوانح مولانا روم کے دیباچے (ص ۹) میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے، وہ فقر و تصوف ہے اور اس لحاظ سے متکلمین کے سلسلے میں ان کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری لکھنا، لوگوں کو موجب تعجب ہوگا، لیکن ہمارے نزدیک اصلی کلام یہی ہے کہ اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق و معارف اس طرح بتائے جائیں کہ خود بخود دلنشین ہو جائیں۔ مولانا نے جس خوبی سے اس فرض کو ادا کیا ہے، مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے، اس لیے ان کو زمرۂ متکلمین سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے''۔

ہمارے فقہاء اور عرفا نے الٰہیات، صفات باری تعالیٰ، ثبوت، روح، معاد، جبر و قدر، تصوف، توحید، مقامات سلوک، عبادت، فلسفہ وغیرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے بحث کی ہے۔ اس نوعیت کے مباحث شروع ہی سے موضوع شرح و تفسیر رہے ہیں۔ علامہ شبلی نے بھی مثنوی میں ان ہی موضوعات سے متعلق مباحث کو علم کلام کی روشنی میں پرکھا ہے اور دکھایا ہے کہ مولانا سے قبل اور حتیٰ کہ بعد کے حضرات بھی ان موضوعات پر اس طرح صراحت سے گفتگو نہیں کر سکے جو مولانا کا طرۂ امتیاز ہے۔ مولانا ان مباحث کو تمثیلات کی مدد سے اس طرح واضح کرتے ہیں کہ

عام قاری بھی ان موضوعات کی جزئیات، اہمیت اور مناسبت سے واقف ہوجاتا ہے۔ مولانا کے تمثیلی استدلال نے بعض ایسے مسائل جیسے جبر وقدر اور قناعت وغیرہ کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ان کے بارے میں ہر قسم کی غلط فہمیاں دور ہوگئی ہیں۔

یہاں مثال کے طور پر علامہ شبلی نے قناعت کے بارے میں مولانا کے عقیدے کی وضاحت کی ہے اور دکھایا ہے کہ مولانا نے اس ضمن میں بعض صوفیہ سے مختلف رویہ اختیار کیا ہے۔

اکثر صوفیہ توکل کو سلوک کا بڑا پایہ سمجھتے ہیں اور یہ خیال رفتہ رفتہ مختلف صورتوں میں قوم کے اکثر افراد میں سرایت کرگیا ہے۔ مولانا نے اس مسئلے کو ایک فرضی مناظرے کے ذیل میں طے کیا ہے۔ یہ مناظرہ جنگل کے جانوروں اور شیر میں واقع ہوا ہے۔ جانوروں نے توکل اور شیر نے جہد اور کوشش کا پہلو اختیار کیا ہے۔

اس مناظرے میں کسب اور کوشش کے مقابلے میں اہل توکل جن جن چیزوں پر استدلال کرتے ہیں اور کرسکتے ہیں، مولانا نے ایک ایک کا بیان کیا ہے اور ان کا جواب دیا ہے۔ پھر کوشش اور جہد کی افضلیت پر جو دلیل قائم کی ہے وہ اس قدر پر زور ہے کہ اس کا جواب نہیں ہوسکتا۔ یعنی یہ کہ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے غلام یا نوکر کے ہاتھ میں کدال یا پھاوڑا دے دے تو صاف معلوم ہوجائے گا کہ اس کا کیا مقصد ہے۔ اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قوت دی ہے تو اس کا صاف یہی مقصد ہوسکتا ہے کہ ہم ان آلات سے کام لیں اور ارادے واختیار کو عمل میں لائیں۔ اس بنا پر توکل اختیار کرنا گویا خدا کی مرضی اور ہدایت کے خلاف کرنا ہے۔

علامہ مولانا کے اس عقیدے کو بیان کرنے کے بعد احتیاطاً یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ: باقی توکل کی جو فضیلت شریعت میں وارد ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک کام میں جب کوشش کرو تو کوشش کے نتیجے کے متعلق خدا پر توکل کرو، کیونکہ کوشش کا کامیاب ہونا انسان کی اختیاری چیز نہیں، بلکہ خدا کے ہاتھ ہے۔

مسائل کے تجزیے اور ان کے حل کرنے میں مولانا کا دوسروں سے مختلف رویہ اختیار کرنے کا سبب علامہ شبلی کی نظر میں یہ ہے کہ یہ طریقۂ دین ہے مولانا کے کمال اجتہاد کی اور قوت قدسیہ کی۔

علامہ شبلی مولانا روم کی مثنوی کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

’’فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم ونثر میں لکھی گئی ہیں، کسی میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فارسی پر موقوف نہیں، اس قسم کے نکات اور دقایق کا عربی تصنیفات میں بھی مشکل سے پتا لگتا ہے۔ اگر علماء اور ارباب فن نے مثنوی کی طرف تمام کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی اور یہاں تک مبالغہ کیا کہ ’’ہست قرآن درزبان پہلوی‘‘ تو کچھ تعجب کی بات نہیں‘‘۔

ہندوستان میں مولانا اور ان کی مثنوی کی مقبولیت کا ذکر ہو اور علامہ اقبال کا نام نہ آئے، یہ ناممکن ہے۔ مولانا روم اور اقبال پر کسی بھی بحث کا یہ موقع نہیں، چونکہ یہ بڑا طویل موضوع ہے، اس لیے اس ضمن میں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ مولانا کو نہ صرف اس براعظم میں بلکہ باہر کی دنیا میں بھی متعارف کرانے کی جو کوشش اقبال نے کی ہے، وہ خود ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تردد نہیں کہ باہر کی دنیا میں مولانا پر آج جو توجہ دی جارہی ہے، اس کی بڑی وجہ مولانا کے بیسویں صدی کے اسی مرید پرخلوص کی فارسی اور اردو میں بے نظیر آثار کی مرہون منت ہے۔

مقدمہ آب حیات ۔ مستفاد یا مستعار؟

ڈاکٹر شمس بدایونی

مولانا محمد حسین آزاد (۱۰؍ جون ۱۸۳۰ء - ۲۱؍ جنوری ۱۹۱۰ء) کی تصنیف ''آب حیات'' کی تکمیل ۱۸۸۰ء (۱۲۹۷ھ) میں ہوئی تھی اور اسی سال یہ وکٹوریہ پریس لاہور میں چھپ کر شائع بھی ہوگئی تھی۔ کتاب کے صفحات کی تعداد (۵۰۷ + ۲) = ۵۰۹ ہے اس کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ امتداد زمانہ سے اس کے اوراق بوسیدہ ہو چکے ہیں۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے لکھا ہے:

> (یہ) تاریخ ادب اردو پر پہلی کتاب ہے۔ گو اس میں تاریخی مسامحات پائے جاتے ہیں مگر اس کی عبارت کی لطافت اور شوخی ان سب پر پردہ ڈالے ہوئے ہیں۔ (دستور الفصاحت، ص ۱۰۹)

آب حیات کے شروع میں ایک طویل ومبسوط دیباچہ ہے جسے اب مقدمہ ''آب حیات'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس مقدمے نے تاریخ زبان وادب کے نظریات میں فکر واختلاف کے کئی در وا کیے اور زبان کے آغاز کے تعلق سے سنجیدہ علمی مباحث کا سلسلہ شروع کیا۔

آزاد کے معاصر مولوی عبدالحئی صفا بدایونی (ف ۹؍ اگست ۱۹۱۴ء) کا موضوع تاریخ ادب، صحافت اور اسلامیات تھا۔ ان موضوعات پر انہوں نے تقریباً دو درجن سے زائد کتب تصنیف وتالیف کیں۔ اکثر کتب طبع ہوئیں جن میں عمدۃ التاریخ دو جلد (مرادآباد ۱۸۷۹ء)، تذکرہ مذاق سخن (بدایوں ۱۸۸۱ء)، تذکرہ شمیم سخن دو جلد، خیر الکلام فی احوال العرب والاسلام پانچ جلد (بدایوں ۱۸۹۹ء)، تذکرۃ الصلحاء (بدایوں ۱۹۱۱ء) اہم ہیں۔

۵۸، نیو آزاد پورم کالونی، عزت نگر، بریلی، ۲۴۳۱۲۲۔

تاریخ ادب اردو میں صفا کا نام بحیثیت تذکرہ نویس درج ہوتا رہا ہے اور ان کے تذکرے شمیم سخن کے حوالے بھی دیے جاتے رہے ہیں لیکن باعث حیرت امر یہ ہے کہ اپنے عہد کی تذکرہ نویسی کی روایت سے مختلف اور کسی قدر نئی روایت تشکیل دینے کے باوصف اس تذکرے کا ابھی تک مفصل جائزہ نہیں لیا جاسکا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں تالیف ہوا، یعنی آب حیات سے آٹھ سال پیشتر۔ اور اس کے طویل دیباچے یا مقدمے میں (جو تقریباً ۸۲ صفحات کو محیط ہے) اردو زبان اور اردو شاعری کے آغاز و ارتقاء پر آزاد کی طرح پہلی مبسوط اور جامع بحث کی گئی ہے۔ اسی بحث کے دوران اردو کا منبع و مخرج برج بھاشا کو قرار دیا گیا ہے (ص:۱۱) اردو کے وجود کو ۱۳۰۰ عیسوی سے پایا لکھا گیا ہے (ص:۱۴) اور نظم اردو کے موجد امیر خسرو (ف ۱۳۲۵ء) قرار دیے گئے ہیں (ص: ۱۵)، ولی دکنی (ف ۱۷۰۷ء) کو تکمیل شاعری کا آفتاب بتایا گیا ہے (ص ۱۹) وغیرہ۔

صفا نے دیباچہ میں دبستان دہلی و لکھنؤ کی شعری خصوصیات، اور ادب، اخلاق و سماج کے تعلق سے بھی بعض باتیں لکھی ہیں جو بیک نظر آزاد و حالی سے پہلے کی معلوم ہوتی ہیں۔

مولانا آزاد نے آب حیات کے مقدمے میں زبان اردو و نظم اردو کی تاریخ پر جو کچھ لکھا ہے وہ مضامین، خیالات، حوالوں، مثالوں اور جملوں کی یکسانی و مشابہت کے سبب بہ ظاہر شمیم سخن سے مستفاد و مستعار معلوم ہوتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں شمیم سخن کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے آزاد و صفا کی تحریروں کے ان حصوں پر گفتگو مقصود ہے۔ جو یکسانی خیالات اور مشابہت زبان و بیان کے سبب ایک دوسرے سے مستفاد و مستعار معلوم ہوتے ہیں۔

شمیم سخن حصہ اول (تذکرہ شعراء) ۲۲×۳۰ تقطیع کے ۲۹۰ صفحات پر پہلی مرتبہ ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء میں مطبع امداد الہند و عین الاخبار مراد آباد سے شائع ہوا۔ تذکرہ باعتبار حروف تہجی ترتیب دیا گیا ہے۔ تذکرے میں ان ۵۹۸ شعراء کے تراجم پیش کیے گئے ہیں جو ۱۲۹۸ھ/۱۸۷۱ء یا اس سے پیشتر وفات پا چکے تھے۔ تذکرے میں شعراء کے سنین پیدائش و وفات درج کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ حالات مختصر مگر سلیقے کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

تذکرے کی ترتیب میں تاریخی شعور سے کام لیا گیا ہے۔ قدیم تذکرہ نویسوں کی تقلید

سے گریز کیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کو یہ اعتراف کرنا پڑا:

''شمیم سخن اور آب حیات میں تذکرہ نگاری گویا تاریخ کی سرحدوں میں براہ راست داخل ہوجاتی ہے۔ان میں ہمیں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو (جس کی) کسی قدیم ادبی تاریخ سے توقع کی جاسکتی ہے''۔(تذکروں کا تذکرہ نمبر،ص:۳۹)

خود مولف شمیم سخن نے لکھا ہے:

''میں مورخ ہوں اور بہ لحاظ اصول تاریخ نویسی کسی خاص شخص یا خاص گروہ کی جانب مخاطب نہیں ہوں۔ جو کچھ لکھتا ہوں زمانہ سابق کی حالت تحقیق کرکے اور زمانہ موجود کی حالت دیکھ کر لکھتا ہوں۔مجھ کو کسی کی مدح یا مذمت سے مطلب نہیں ہے''۔(شمیم سخن،ص:۱۱)

تذکرے میں مآخذ کی فہرست نہیں دی گئی ہے۔دیباچہ میں چار تذکروں کا ان کی خصوصیات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔(ص:۹) وہ چار یہ ہیں:

گلشن بیخار (شیفتہ،مرقومہ ۱۸۳۴ء)،گلستان سخن (صابر،مرقومہ ۱۸۵۵ء)،سخن شعراء (نساخ،۱۸۶۴ء)،تذکرہ شعرائے دکن (نادر،مرقومہ ۱۸۷۱ء)،ان کے علاوہ تذکرہ دتاسی کا حوالہ بھی ملتا ہے۔(ص:۱۸)

تذکرے کے آخر میں ایک اشتہار ہے جس میں جلد دوم وسوم کے عنقریب شائع ہونے کی اطلاع دی گئی ہے۔جلد دوم بصورت تذکرہ شاعرات ۱۳۰۰ھ/۸۳-۱۸۸۲ء میں طبع ہوئی۔ لیکن جلد سوم کی اشاعت کا تحریری ثبوت نہیں ملتا۔غالباً یہ جلد ۱۸۷۱ء کے بعد حیات شعراء کے تراجم کے لیے زیر منصوبہ یا زیر قلم رہی ہوگی۔

سطور ذیل میں مقدمہ آب حیات و شمیم سخن کی وہ عبارتیں نقل کی جارہی ہیں جن کی یکسانی و مشابہت زیر نظر مضمون لکھنے کا محرک بنی۔

شمیم سخن	آب حیات
واضح ہو کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ (ص:۱۱)	اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ (ص:۶)

جن لوگوں کی بولی بھاشا تھی ان کو ایرین (آرین) یا آریہ ورت کہتے ہیں۔ اکثر مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ آریہ لوگوں کا وطن اصلی مصر یا نواح مصر تھا۔ وہاں سے یہ لوگ نقل مکان کر کے اولاً جیحوں سیحوں کے میدانوں میں قریب کوہ بلور تاغ یا مستاغ کے آئے اور سکونت قبول کی۔ ان میں سے ایک گروہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور دوسرا ایران میں رہا، یہ لوگ عالی حوصلہ، جواں مرد، تعلیم یافتہ تھے......ان کی زبان سنسکرت تھی۔

(ص:۱۲-۱۱)

یہ فتح یاب غالباً جیحوں سیحوں کے میدانوں سے اٹھ کر اور ہمارے شمالی پہاڑ الٹ کر اس ملک میں آئے ہوں گے......وہ لوگ دل کے بہادر، ہمت کے پورے، صورت کے وجیہہ اور رنگ کے گورے ہوں گے اور اس زمانہ کی حیثیت کے بموجب تعلیم یافتہ بھی ہوں گے ......اس قوم کا نام ایرین (آرین) تھا اور عجیب (عجب) نہیں کہ ان کی زبان وہ ہو جو اپنے اصل سے کچھ کچھ بدل کر اب سنسکرت کہلاتی ہے۔

(ص:۶)

جب آریہ لوگوں نے ہندوستان میں قیام کیا تو اپنی زبان کا نام دیوبانی یعنی زبان الٰہی رکھا اور قدیم باشندگان ہند کو اس زبان کے سیکھنے سے باز رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ میں سنسکرت کے اکثر لفظ یہاں کے باشندوں کی زبان کے ساتھ خلط ملط ہو کر قطعے قطعے میں پراکرت زبانیں جاری ہوگئیں۔ جیسے شورسینی، مہاراشٹری، ماگدی یعنی مگدھی، تلنگی اڑیا۔

(ص:۱۱)

اسی بنیاد پر فتحیابوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت رکھا ...... ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بزرگان دین ہی اسے پڑھائیں تو پڑھائیں بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں آواز پڑے۔ اس زبان کا نام دیوبانی ہوا یعنی زبان الٰہی، ان کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آ کر کچھ اور ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعہ قطعہ میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہوگئی ہوں گی۔ جیسے اسلام کے بعد اردو۔ چنانچہ ماگدی (پالی) شورسینی، مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتا بتاتی ہیں۔

(ص:۸)

۵۴۳ قبل مسیح شاگ منی، بانی مذہب بدھ نے ماگدی پراکرت کو رواج دیا اور دفعتاً یہ پراکرت اکثر اقطاع ہند کے دربار اور دفتروں کی زبان ہوگئی۔

(ص:۱۲)

دفعتاً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاک منی پیدا ہوئے، وہ مگدھ دیس سے اٹھے تھے۔اس لیے وہیں کے پراکرت میں وعظ شروع ...... کیا اور مگدھ دیس کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہوگئی۔

(ص:۱۰)

راجہ بھرت کے عہد سے برج کے قطعے میں بھاشا زبان بولی جاتی تھی جو شورسینی بھاکا کہلاتی تھی۔

(ص:۱۲)

راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعے کی وہ زبان تھی جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں۔

(ص:۱۱)

۱۶۴۰ء میں بہ عہد شاہ جہاں شہر و شہر پناہ کی تعمیر ہوکر نئی دہلی دارالسلطنت ہوئی اور شاہ جہاں آباد نام پایا۔ بادشاہ اور اس کے ارکان سلطنت اور مشیران دولت اور ہندی اور ایرانی و کابلی و عربی و ترکی لشکر جمع ہوکر یکجا رہنے لگا۔ علاوہ ان کے مختلف ملکوں اور صوبوں کے لوگ جن کی مختلف زبانیں تھیں ایک جا جمع ہوئے تو لین دین،نشست و برخاست روزمرہ میں ایک دوسرے سے گفتگو کرنی پڑی۔ آخرش ہر زبان کے الفاظ مل کر چند روز بعد ایک نئی زبان پیدا ہوگئی اور نام اس کا اردو رکھا گیا لیکن اس وقت کوئی کتاب نظم یا نثر اردو زبان میں تصنیف یا تالیف نہیں ہوئی کہ جس سے پورا پورا نمونہ اس عہد کی زبان کا معلوم ہو۔

(ص:۱۲-۱۳)

رفتہ رفتہ شاہ جہاں کے زمانے میں کہ اقبال تیموری کا آفتاب عین اوج پر تھا شہر اور شہر پناہ تعمیر ہوکر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے، اہل سیف، اہل قلم، اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوے۔ ترکی میں اردو بازار لشکر کو کہتے ہیں۔ اردوے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اردو ہوگیا۔

(ص:۲۰)

۱۱۴۵ ہجری میں جو زمانہ سلطنت محمد شاہ کا تھا ایک شاعر فضلی تخلص نے اردو زبان میں ''دہ مجلس'' تالیف کی جو پہلی کتاب نثر اردو کی خیال کی جاتی ہے۔

(ص:۱۴)

البتہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۴۵ھ میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے ''دہ مجلس''، لکھی، اس کے دیباچہ میں سبب تالیف لکھتے ہیں اور غالباً یہی نثر اردو کی پہلی تصنیف ہے۔

(ص:۲۳)

اس کے بعد مرزا رفیع السودا کی نثر اور انشاء اللہ خاں انشاء کی نثر تالیفات ہیں لیکن اسی ڈھنگ کی جیسا کہ طرز تحریر صاحب ''دہ مجلس'' کا ہے۔ جو یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ ابھی تک انشاپردازی اردو فقط شعراء کی زبان پر تھی کسی کو نثر کے حال پر توجہ نہ تھی۔

(ص:۱۴)

مرزا رفیع اور انشاء کی نثر کے نمونے درج کرنے کے بعد مولف آب حیات لکھتے ہیں: ''بہرحال اس وقت تک انشاپردازی اور ترقی اور وسعت، زبان اردو کی فقط شعراء کی زبان پر تھی ...... وہ بھی فقط نظم میں نثر کے حال پر کسی کو اصلاً توجہ نہ تھی۔

(ص:۲۵)

۱۸۳۵ء سے سرکاری دفاتر میں زبان اردو کا رواج شروع ہوا۔

(ص:۱۴)

۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔

(ص:۲۶)

اس میں کسی کو کلام نہ ہوگا کہ نظم اردو نثر سے بہت پہلے رائج ہوئی۔

(ص:۱۵)

زبان اردو کے ظہور پر خیال کریں اور اس کی تصنیفات پر نگاہ کریں تو اس میں نثر سے پہلے نظم نظر آئے گی۔

(ص:۱۷)

خالق باری جو ایک نصاب کی کتاب ہے اور جو ہندوستانی مکاتب میں علی العموم روائج ہے وہ ان کی اختراع کا ثبوت ہے، اس کتاب سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس وقت میں کون کون سے

خالق باری جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی، اس میں فارسی کی بحروں نے اول اثر کیا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کون کون سے الفاظ

الفاظ مستعمل تھے جواب متروک ہیں۔	مستعمل تھے جواب متروک ہیں۔
(ص:۱۵)	(ص:۱۷)

سطور بالا میں جو عبارتیں متحد الخیال و زبان نقل کی گئی ہیں یہ چند تو بطور مثال ہیں۔ مقدمے کے بالاستیعاب مطالعے سے متعدد عبارتیں اور بھی فراہم کی جاسکتی ہیں۔ مذکورہ عبارتوں کے ان جملوں پر مزید غور کرلیا جائے جن کی یکسانیت چونکا دیتی ہے:

شمیم سخن	آب حیات
اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔	اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔
(ص:۱۱)	(ص:۶)
قطعے قطعے میں پراکرت زبانیں جاری ہوگئیں۔	قطعے قطعے میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہوگئی ہوں گی۔
(ص:۱۱)	(ص:۸)
پراکرت اکثر اقطاع ہند کے دربار اور دفتروں کی زبان ہوگئی۔	پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہوگئی۔
(ص:۱۲)	(ص:۱۰)
شہر وشہر پناہ کی تعمیر ہوکر نئی دہلی دار السلطنت ہوئی۔	شہر اور شہر پناہ تعمیر ہوکر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی۔
(ص:۱۲)	(ص:۲۰)
کسی کو نثر کے حال پر توجہ نہ تھی۔	نثر کے حال پر کسی کو اصلاً توجہ نہ تھی۔
(ص:۱۴)	(ص:۲۵)
۱۸۳۵ء میں سرکاری دفاتر میں زبان اردو کا رواج شروع ہوا۔	۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔
(ص:۱۴)	(ص:۲۶)
کہ اس وقت میں کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جواب متروک ہیں۔	کہ اس وقت کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جو اب متروک ہیں۔

(ص:۱۵) (ص:۱۷)

ملکیت تصنیف کی تعیین میں اسلوب کی تلاش، اظہار بیان کی شکلیں، تصورات وخیالات کی تکرار داخلی شہادتوں کے زمرے میں آتی ہیں لیکن یہاں معاملہ سراسر کسی تصنیف کو اپنے نام سے منتسب کر کے شائع کرنے کا نہیں بلکہ ایک تحریر میں پیش کردہ مواد، خیالات اور تھیسس کو اپنی زبان وبیان میں منتقل کرنے کا ہے۔ دونوں مصنّفین باوقار اور ثقہ ہیں لیکن جو صورت حال پیش نظر ہے اس کی بنیاد پر ہر صاحب قلم یہ لکھنے پر خود کو مجبور پائے گا کہ آب حیات کے مصنف نے شمیم سخن کے مقدمہ سے مرکزی خیال ومواد اخذ کر کے اپنے مقدمے کی بنیاد رکھی اور صفا کا حوالہ نہ دے کر اخلاقی بددیانتی کا ثبوت دیا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ''نگار'' کے مرتبہ تذکروں کا تذکرہ نمبر (۱۹۶۴ء) میں شمیم سخن کا تعارف کراتے ہوئے مقدمہ کے سلسلے میں لکھا ہے:

''اس تذکرے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زبان اردو اور شاعری کی تاریخ پر ایک مبسوط بحث بھی اس میں شامل ہے۔ یہ بحث آب حیات کے مقدمہ کی طرح جامع ہے اور کم وبیش وہی باتیں کہی گئی ہیں جنہیں بعد کو آزاد نے ''آب حیات'' میں درج کیا اور شہرت دوام حاصل کی۔ افسوس ہے کہ آزاد نے ''شمیم سخن'' یا اس کے مصنف عبدالحیٔ کا کوئی حوالہ آب حیات میں نہیں دیا۔ ورنہ آب حیات اور شمیم سخن کا تقابلی مطالعہ صاف پتا دیتا ہے کہ اردو زبان وشاعری کے سلسلے میں آزاد نے جو کچھ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء میں لکھا اسے صفا بدایونی آٹھ سال پہلے ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء میں لکھ چکے تھے''۔ (ص:۲۹۵)

''آب حیات'' کے تعارف میں مقدمہ کا ذکر بار دگر اس طرح کرتے ہیں:

''آب حیات کا مقدمہ بھی اردو کی تاریخ میں نہایت اہم خیال کیے جانے کے لائق ہے۔ گارساں دتاسی کے ''تاریخ ادب ہندوستانی''، امام بخش صہبائی کے ''انتخاب دواوین''، کریم الدین اور فیلن صاحب کے طبقات الشعراء اور قادر بخش صابر کے ''گلستان سخن'' میں اگرچہ اس انداز کے مباحث ملتے ہیں لیکن ان میں آب حیات کی سی جامعیت وادبی دلکشی نہیں ہے۔ شمیم سخن مولفہ عبدالحیٔ صفا کا

دیباچہ البتہ آب حیات کے مقدمہ کے انداز کا ہے اور اردو کے آغاز وارتقاء کے متعلق تقریباً آزاد نے وہی کہا ہے جو صفا کہہ چکے تھے''۔(ص:۳۳۵-۳۳۴)

دراصل ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے سامنے تذکرہ شمیم سخن کا وہ ناقص الآخر نسخہ تھا جو انجمن ترقی اردو کراچی کی ملکیت ہے۔شمیم سخن کے شروع میں سال اشاعت مذکور نہیں۔آخری صفحے پر تذکرے کے اشتہار کے ضمن میں اس کے سال اشاعت کا اندراج ہوا ہے۔جو نسخے کے ناقص الآخر ہونے کے سبب ان کی نظروں سے اوجھل رہا۔بایں سبب سال تالیف ۱۸۷۲ء ہی کو انہوں نے غالباً سال اشاعت سمجھا۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی مرتبہ ''دستور الفصاحت'' میں شمیم سخن کے تعارف میں چند سطور ملتی ہیں۔ان میں اس کا سال اشاعت مذکور نہیں۔مولانا عرشی کے پیش نظر شمیم سخن کا جو نسخہ تھا (مخزونہ رضا لائبریری رام پور) اس کی پشت پر سال اشاعت مذکور ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی طرح مولانا عرشی بھی شمیم سخن کی ۱۸۸۰ء سے پیشتر کی کسی اشاعت کے امکان کے قائل ہیں اور شمیم سخن کی اولین اشاعت کے بارے میں کسی فیصلے پر پہنچے بغیر سنہ مذکور کا اندراج نامناسب خیال کرتے ہوں۔واللہ اعلم لیکن یہ اشاعت کب دریافت ہوگی اور کب یہ راز سربستہ حل ہوگا ہمارے علم میں نہیں۔

راقم الحروف نے بھی آج سے ۱۷ سال پیشتر اپنے مضمون ''بدایوں میں اردو تذکرہ نویسی کی روایت'' (مطبوعہ سہ ماہی اردو ادب، دہلی، شمارہ ۴-۳، ۱۹۹۴ء) میں مقدمہ آب حیات کو شمیم سخن سے مستفاد و مستعار قرار دیا تھا اور دونوں تذکروں کے سال اشاعت کے زمانی بُعد کو نظر میں رکھتے ہوئے آزاد کا شمیم سخن سے استفادہ کرنے کا قرینہ بھی طے کر دیا تھا جو اس طرح تھا:

> ''یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب ''شمیم سخن''، ''آب حیات'' کی اشاعت (۱۸۸۰ء) کے چار سال بعد (۱۸۸۴ء) شائع ہوا۔اس صورت میں آزاد کا صفا کے دیباچہ سے استفادہ کرنا کیوں کر قرین قیاس ہوسکتا ہے۔اس اشکال کو رفع کرنے کی دو صورتیں ہیں۔اول صورت تو وہی ہے کہ شمیم سخن کی ایک اشاعت ۱۸۷۲ء میں تسلیم کرلی جائے اور ۱۸۸۴ء کی اشاعت کو طبع دوم میں شمار کیا جائے۔

جیسا کہ بعض اہل قلم کرتے رہے ہیں۔ خود ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی غالباً یہی تسلیم کرتے ہیں۔ دوسری صورت یہ قیاس کرنا ہوگا کہ چونکہ آزاد اور مذاق بدایونی کے درمیان استاد بھائی ہونے کی نسبت سے مراسلت تھی (آئینہ دلدار، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۱۱۶) لہٰذا مذاق اور آزاد کا تعلق، آزاد اور صفا کے تعلق کا سبب بن گیا ہو اور تذکرہ مذکور اسی تعلق کی بنا پر آزاد کی نظر سے گزرا ہو'۔ (نقد و اثر، دہلی ۲۰۰۴ء ص: ۱۹۰)

لیکن تحقیق کا اصول یہ ہے کہ جو تصنیف، تالیف، مضمون، نظریہ، شعر، تھیسس اشاعت میں اولیت رکھتا ہے۔ ملکیت تصنیف کی تعیین میں بھی اس کی اولیت برقرار رہے گی۔ آب حیات کی اشاعت ۱۸۸۰ء میں عمل میں آئی اور چار سال بعد ۱۸۸۴ء میں شمیم سخن شائع ہوئی۔ جب تک ۱۸۸۰ء سے پیشتر شمیم سخن کی کسی اشاعت تک رسائی نہیں ہو جاتی۔ آزاد کی اولیت قائم رہے گی۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ مقدمہ میں پیش کردہ خیالات حقیقتاً کس کے ہیں، ان خیالات سے استفادہ کرنے والے نے اعتراف کیوں نہیں کیا اس سلسلے میں کچھ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی و حال کے مصنفین کے ذخیرۂ تصانیف سے استفادے کا اعتراف نہ کرنے کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں اور اس طرح کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک ہی خیال یا تھیسس تک دو افراد پہنچ گئے جب کہ اس کے بیچ زمانی و جغرافیائی فاصلہ بھی موجود تھا۔ اس طرح کے عمل کو تحقیق کی اصطلاح میں انتحال (کسی کا شعر یا سخن اپنے نام سے ظاہر کرنا) کیا جاتا ہے لیکن ایسا ہوا ہے اور ایسا ہوتا رہے گا۔

کتابیات

۱- آب حیات مولانا محمد حسین آزاد رام نرائن لال بنی مادھو الٰہ آباد ۱۹۷۶ء۔

۲- بہار بوستان شعراء حافظ محمد فضل اکرم فرشوری مطبع صبح صادق بدایوں ۱۸۸۲ء۔

۳- دستور الفصاحت مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ہندوستانی پریس رام پور ۱۹۸۳ء۔

۴- شمیم سخن عبدالحیٔ صفا بدایونی مطبع امداد الہند و عین الاخبار مراد آباد ۱۸۸۴ء۔

۵- نقد و اثر (مجموعہ مضامین) شمس بدایونی اردو بک ریویو دہلی ۲۰۰۴ء۔

۶- نگار کراچی، سالنامہ بہ عنوان تذکروں کا تذکرہ نمبر مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی ۱۹۶۲ء۔

''خلاصۃ التواریخ''
حکومت دہلی کی عمومی تاریخ

نیلوفر حفیظ

''تاریخ''، ہمارا وہ گراں قدر و بیش قیمت سرمایہ ہے جو انسان کو ظلمت شب سے نکال کر ضوء روز سے متعارف و مانوس کراتا ہے تاریخی سرمایہ خواہ کسی بھی زبان کا ہو عہد گزشتہ کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، ثقافتی و مذہبی حالات و واقعات کی آگہی کا سب سے مستند و معتبر و مستحسن ماخذ ہوتا ہے مزید برآں حکومتوں کے عروج و زوال، قوموں کی بلندی و پستی، دنیا میں ظہور پذیر ہونے والی ہمہ ترقیات و تنزلات کے پس پشت کون سے عوامل و اسباب کارفرما تھے ان حقائق کی پردہ دری بجز تاریخ ممکن نہیں ہے اگر کچھ وقفے کے لیے تاریخی سرمایہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے امروز و فردا کی کوئی منصوبہ بندی یا کوئی فیصلہ تجویز کرنا ہو تو سوائے تاریک راہوں میں بھٹکنے اور صحرا پیمائی کے کچھ حاصل نہ ہو سکے گا اپنے اطراف میں ایک سکوت و جمود، خوف و ہراس اور انتشار و بحران کی فضا چھائی ہوئی محسوس ہوگی اور ایک بے بسی و لاچاری، مجبوری و معذوری اور بے دست و پائی کا احساس ہوگا اور حال و مستقبل سے متعلق کوئی راہ متعین کی جا سکے گی اور نہ کوئی فیصلہ لینے کی اہلیت ہی پیدا ہوگی غرض زندگی کا ہر شعبہ اپنی ترقی و پیش رفت کے لیے علم تاریخ کا محتاج و مجبور ہے۔

> ''......زندہ لوگ اپنی تاریخ کو بھی زندہ رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ کوئی شخص یا گروہ اپنی تاریخ سے رشتہ توڑ کر نہ باوقار طور پر ترقی کر سکتا ہے نہ باعزت طور پر زندہ رہ سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تشخص اور خود اعتمادی کے لیے سب سے محکم بنیاد تاریخ ہے۔ کسی گروہ، علاقہ یا ملک کو لے لیجیے اگر ان کا

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی مولانا آزاد اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس۔

تاریخی سرمایہ محفوظ رہا ہے تو ان میں خود شناسی اور اعتمادی کا جوہر زندہ ہے۔
تاریخ قومی حافظہ ہے یہ گیا تو پھر نام ونشان بھی گیا......''۔(۱)

تاریخ گزرے ہوئے زمانے کے حالات کو جاننے کا واحد ذریعہ ہے لیکن ماضی کے سانحات، حوادث، واقعات اور حالات کو قرطاس کے سپرد کردینے کا نام ''تاریخ'' ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ ایک دشوار، پیچیدہ اور سنجیدہ فن ہے۔ جس کے لیے مورخ کو انتھک محنت ومشقت، تلاش و جستجو اور کاوش وکوشش کو بروئے کار لانا پڑتا ہے تاکہ گمنامی میں دفن حقائق کو بے نقاب کرکے سراغ منزل میں پریشان وسرگرداں لوگوں کی راہنمائی ہوسکے اور آیندگان کے لیے یہ حقائق مشعل راہ کا کام کرسکیں۔

''......انسانی تہذیب نے خوب سے خوب تر کی تلاش میں جو ارتقائی سفر طے کیا اور جن وادیوں سے یہ کارواں رنگ و بو گزرا ہے ان کی روداد جب الفاظ کا پیکر اختیار کرتی ہے تاریخ بن جاتی ہے لیکن تاریخ ماضی کے واقعات کو صرف دہرادینے ہی کا نام نہیں بلکہ ماضی کی بازیافت کا فن ہے......''۔(۲)

تاریخ زمانہ گزشتہ کی حکومتوں اور سلطنتوں کے جھوٹے وسچے واقعات کو پیش کردینا نہیں ہے بلکہ تاریخ نویس کے لیے لازم ہے کہ وہ واقعات کو من وعن بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سماج میں رونما ہونے والے تمام اہم واقعات کو بھی ضبط تحریر میں لائے اثنائے تحریر تاریخ، صداقت ودیانت کو پیش نظر رکھا جائے اگر تاریخ ترتیب دیتے وقت حقائق کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا تو وہ تاریخ نہیں بلکہ داستان گوئی وسحر طرازی ہے جو بسا اوقات اس قدر گمراہ کن وتباہ کن بن جاتی ہے کہ اس کا ازالہ ممکن نہیں ہوتا۔

''......تاریخ کی کتابوں میں ہم کو صرف بادشاہوں کی تخت نشینی یا ان کی وفات کی تاریخیں، ان کی فتوحات ان کے عہد کے عظیم کارنامے ان کی علم وہنر کی قدردانی یا ان کی رفاہ عام کے کاموں میں دلچسپی ہی کا ذکر نہیں ملتا بلکہ تاریخی اہمیت کے پیچھے جو علل کے سلسلے تھے ان کا علم بھی بہم پہنچاتا ہے......''۔(۳)

تاریخ ایک ایسا علم ہے جو دروغ وکذب وافتراء کے بیابانوں سے نجات دلاکر حقائق

کی صداقت و لطافت سے روشناس کراتا ہے لیکن بعض اوقات مورخین کی کم فہمی و سہل پسندی کے سبب وہ گمراہی کا سبب بھی بن جاتا ہے اور حقیقت سے روشناس کرانے کے بجائے ایسی راہوں کا مسافر بنا دیتا ہے کہ جن میں بھٹک کر منزل مقصود سے محرومی ملتی ہے، حقائق ہمیشہ کے لیے گمنامی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں عام طور پر ایسا اس وقت ہوتا ہے جب تاریخ نگار ملک وقوم کے مفاد کے بجائے اپنا نفع پیش نظر رکھتا ہے یا پھر کسی مصلحت یا بادشاہ وقت کے خوف سے حقائق کی پردہ دری کے بجائے پردہ پوشی کو اپنا شیوہ قرار دیتا ہے بے شمار ایسے شواہد موجود ہیں جن سے ہویدا ہے کہ یہ علم جس قدر نفع بخش ہے اتنا ہی ضرر رساں بھی، بعض مورخین کی مصلحت پسندی نے بہت سے تاریخی حقائق پر اتنے دبیز پردے ڈال دیے ہیں کہ تمام تر مساعی کے باوجود وہ سچ سامنے نہیں آسکے ہیں جن کی مدد سے قوم کی عظمت و وقار پر فخر کیا جاسکے ایک خاص مقصد و منشا کے پیش نظر رقم کی گئی تاریخیں زیادہ تباہ کن و گمراہ کن ثابت ہوتی ہیں۔

> ''......علم تاریخ جس قدر بصیرت افزا و خرد افروز علم ہے وہ بجائے خود عیاں ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی مخفی نہیں ہے کہ اس علم سے ہدایت اور ضلالت دونوں کا کام لیا جاسکتا ہے......''۔(۴)

فن تاریخ کے فرائض کو ادا کرنے کے لیے وسیع مطالعہ، باریک بینی، درستگی فکر اور سلامت فطرت ضروری ہے ایک کامیاب تاریخ نویس وہ ہے جو تحقیق کی پر پیچ، دشوار، خاردار جھاڑیوں میں اپنے لیے راہیں ہموار کرنے کا سلیقہ جانتا ہو جو صبر و سکون و حوصلہ و ہمت سے آراستہ ہو اور جو مشکلات کے کوہ گراں اور تکلیف دہ مراحل کو عبور کرنے کی کما حقہ واقفیت رکھتا ہو کہ حقائق کو اپنی بالغ نظری اور وسیع القلمی کی مدد سے ڈھونڈ سکے اور بدون کسی خوف و مصلحت کے ان کو قرطاس و قلم کے سپرد کر دینے کا عزم مصمم بھی اس میں پایا جاتا ہو۔

> ''......ایک اچھے مورخ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی تحقیق کے ذریعہ حقیقت پر سے اس طرح پردہ اٹھائے کہ قاری اس رفتہ رفتہ حقیقت شناسی کے عمل کے سحر میں مسحور ہو جائے اور یہ سحر اسی وقت ٹوٹے جب وہ آخری حقیقت سے ہمکنار ہو جائے، تاریخ میں سحر پیدا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ قاری

ایک وقت کو اپنے وجود اور فی زمانہ اپنی قدروں سے بالاتر ہوکر اپنے زیر سماج کی تصویر میں گم ہوکر اپنے کو ان میں سمجھنے لگے تاریخ کے ساتھ اس طرح کی وابستگی تاریخ، مورخ اور قاری تینوں کی معراج ہے......''۔(۵)

ہمارے اسلاف کے کارنامہ ہائے رزم و بزم میں سیاسی وسماجی حالات سے متعلق علم تاریخ کا ایک نادر ونایاب ذخیرہ موجود ہے یہ ایک ایسا بحر بے پایاں ہے جس میں غواصی کے بعد بیش قیمت گوہروں سے دامن گراں بار ہو سکتے ہیں یہ بد قسمتی ہوگی کہ اس گراں بہا علمی ذخیرے سے فائدہ نہ اٹھایا جائے، اس سے محفوظ رکھنے کے لیے تنہا فارسی زبان میں ہی متعدد تاریخی کتب ہیں جو زمانہ گزشتہ کے نہ جانے کتنے اسرار ورموز سموئے ہوئے ہیں اور مخطوطات کی صورت میں اپنوں و بیگانوں کی چشم التفات کی متمنی ومتقاضی ہیں، ہماری سرد مہری، بدسلوکی و بے اعتنائی کی نذر ہوکر اس جریدہ عالم سے محو ہوچکی ہیں اور اگر تمام تر حوادث زمانہ کے باوجود کچھ کتب باقی بچی بھی ہیں تو ان کی حیثیت انبار خس وخاشاک سے زیادہ نہیں۔

خلاصۃ التواریخ ان ہی تاریخی کتب کے زمرے میں آتی ہے جو زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہوکر منظر عام پر تو آئی مگر ہماری لاپرواہی اور فارسی زبان سے ہماری ناآشنائی کے سبب وہ مرتبہ ومقام نہ پاسکی جس کی یہ معرکۃ الآراء کتاب مستحق تھی جب کہ مغربی محققین و ناقدین نے اس کی بے پناہ تاریخی اہمیت کا اعتراف اور اس سے استفادہ کیا ہے، اس کتاب کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے اپنی مشہور ومعروف کتاب ''آثارالصنادید'' میں متعدد مقامات پر اس کے حوالے دیے ہیں جو اس کے مستند ومعتبر تاریخ ہونے پر دال ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس ارزشمند واہم تاریخی تصنیف کے مصنف کے احوال وآثار حیات تک ہماری دسترس میں نہیں ہیں خود مصنف نے بھی اپنے احوال حتی کہ نام تک بھی اس پوری کتاب میں کہیں تحریر نہیں کیا ہے نہ ہی اس کے عہدہ یا خاندان وغیرہ کے بارے میں ہی کوئی خاص معلومات ہیں تحقیق ثابت کرتی ہے کہ اس تاریخ کا مصنف سجان رائے بھنڈاری ہے جو کہ پنجاب کے ایک علاقے بٹالہ کا رہنے والا تھا اور غالباً وہ اپنے نام ونشان کو اس لیے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا کہ ہندو ہونے کی وجہ سے اس کی کتاب کی اہمیت کم نہ ہوجائے اس لیے اس نے اس سچائی کو پردہ خفا میں

رکھنا ہی مناسب وموزوں تصور کیا ہو یا پھر وہ بدون کسی لالچ وطمع کے صرف حقائق سے پردہ کشائی کا متمنی رہا ہو یا پھر مصلحت کے تحت یا بادشاہ وقت کے غضب کے خوف سے اس نے اپنا نام ودیگر ضروری معلومات بہم پہنچانا مناسب نہ سمجھا ہو۔

''...... ظاہرا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سجان رائے محض ایک غیر معمولی اور غیر معروف شخص تھا جس کو اپنے اظہار نام سے یہ امید نہ ہوسکتی تھی کہ اس کی تصنیف یا تالیف کی کچھ قدر وقعت بڑھ جاتی......''۔(۶)

بہر کیف اس کتاب میں اس کے متعلق کوئی بھی اہم یا ضروری علم نہیں ملتا لیکن اس کی دوسری تصنیف ''خلاصۃ المکاتیب'' کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ نے مصنف کی زندگی کے متعلق جو معلومات قلم بند کیے ہیں وہ اس طرح ہیں:

''......سجان رائے کی ایک تصنیف خلاصۃ المکاتیب سے معلوم ہوا کہ سجان رائے کا ایک بیٹا رائے سنگھ تھا امام اللہ چشتی جو اس عہد کے ایک بڑے عالم تھے مصنف کے دوست تھے سجان رائے ۱۱۱۰ھ تک شاہی ملازمت سے مستعفی ہو چکا تھا......''۔(۷)

مولف کے بیان کی روشنی میں یہ کتاب دو سال کے عرصے میں اورنگ زیب کے ۴۰ ویں سن جلوس ۱۱۰۷ھ ۱۱۰۸ھ میں مکمل ہوئی اور عالم گیر کے نام معنون کی گئی لیکن اس میں بعد کے بھی احوال ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف اس میں تبدیلی وترمیم کرتا رہا تھا اس نے اس گراں قدر کتاب کے متعلق رقم کیا ہے۔

''...... ایں کتاب را خلاصۃ التواریخ موسوم گردانید وعبارات و استعارات ایں نسخہ بدیعہ را از کتب دیگراں دزدی نکردہ بقدر لیاقت واستعداد خویش بتسطیر درآوردہ وابیات مناسب حال بعضی ازطبع ناقص واکثری از اشعار شعرای نامدار کہ برمحل وبدیہہ بخاطر رسیدہ برنگاشت وایں مجموعہ استعارات و عبارات رادوسہ مرتبہ باصلاح درآوردہ درمدت دو سال درست ساختہ درسنہ چہلم عالم گیری مطابق یک ہزار یک صد وہفتم ہجری و ہزار ہفصد و پنجاہ وسنہ

بکرماجیت و ہزارشش صد ہز دہم سنہ سالباہن و چہار ہزار و ہفصد ونود در ہفت گذشت کلجگ مرتب گردانیدہ......''(۸)

دیباچۂ کتاب میں مصنف نے ہندوستان و ایران میں لکھی جانے والی متعدد تاریخی کتابوں کے نام گنوائے ہیں جن سے دوران تالیف مصنف نے استفادہ کیا تھا اس کے اہم ماخذ میں اکبرنامہ، آئین اکبری، تاریخ پنجاب، بادشاہ نامہ، تیمورنامہ، تاریخ فیروز شاہی، تاریخ فرشتہ، تزک جہاں گیری، ظفرنامہ، طبقات ناصری، طبقات اکبری، مآثر عالم گیری، مفتاح التواریخ، منتخب التواریخ وغیرہ کتابیں ہیں ان کے علاوہ اس نے سنسکرت کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن وہ اصل کتابوں کے بجائے ترجموں پر اکتفا کرتا ہے مثلاً ترجمہ ہربنس، ترجمہ رامائن، ترجمہ جوگ بشش و ترجمہ سنگھاسن بتیسی وغیرہ اس کتاب کے دوران تالیف مصنف کے زیر مطالعہ رہی ہیں جن کی مدد سے اس نے اپنی تالیف کو ایک خاص مقصد کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ سجان رائے غیر معمولی ذہین اور وسیع المعلومات ہے لیکن اپنی علمی بے مائیگی و بے بضاعتی کا اقرار نہایت انکسار سے کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''...... بہ مقتضای بشریت از سہو و خطا خالی نیست دریں صورت امید از منشیان روزگار والا منشان فرخندہ اطوار نیست کہ در وقت سیر و مطالعہ ایں نسخہ اگر عبارتی واستعارتی پسند طبع نشود یا آئین نسخہ و ترتیب کتاب ناخوش آید یا فقرات نا درست و مضامین ناموزوں معلوم گردد و بربی خردی و کم فطرتی ایں احقر العباد مضاحک واستہزا نفرمانید واز روی لطف و کرم عیب پوشی کنند بسان بزرگان خطا پوش اصلاح فرمایند......''۔(۹)

بحیثیت مجموعی یہ کتاب دہلی کے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہونے والے بادشاہوں کی مختصر تاریخ ہے اس تاریخ کو تصنیف کرنے کا مقصد و منشا دہلی سلطنت کے اہم واقعات و حالات کو تفصیلی طور پر پیش کرنا تھا دیگر سلطنتوں کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علم تاریخ سے رغبت رکھنے والے اکثر محققین نے اس سے استفادہ کیا ہے اور اس تاریخ کو دہلی کی بہترین کتابوں میں شمار کیا اور کئی مشرقی و مغربی محققین نے پرمغز مضامین

لکھے، غالباً یہ پہلی ایسی کتاب ہے جو کسی ہندو کے قلم کا کارنامہ ہے جو اس عہد کے سماجی تقاضوں اور تہذیبی رجحانات کی تفہیم میں معاون و مددگار بنتی ہے۔

''...... ہندوؤں کی تمام تاریخوں میں صرف خلاصۃ التواریخ کو یہ شرف حاصل ہوا ہے کہ اس پر مشرق و مغرب کے متعدد فضلا نے اپنی توجہ مبذول کی ہے......''۔(۱۰)

کتاب کے طویل دیباچہ کو اغراض و مقاصد کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے دیباچہ کے بعد تعریف آفرینندۂ عالم کے لیے نہایت پرشکوہ مدحیہ جملے استعمال کیے گئے ہیں۔

''......نقاش نگارخانۂ کائنات و مصور کارگاہ ممکنات چوں اقتضا کرد کہ صور پیرای عجائب ابداع و چہرہ آرای غرائب اختراع گردد بہ وحدت ارادی اربعہ عناصر را با جود تضاد فطری و تخالف طبع باہم امتزاج و اختلاط دادہ برنگ آمیزی ارادات کبریا وضع انگیزی کلک قضا انواع نقوش غریبہ و اشکال عجیبہ بر مرقع تکوین نگاشت و اشباہ متنوعہ و تمثال مختلفہ را برابر زنگ کون نقش بست یعنی بہ قدرت ابداعی وضعت اختراعی گونا گوں خلقت و رنگا رنگ آفرینش از مکامن خفا بہ منصۂ شہود و از جلباب عدم بہ عرصہ وجود آوردہ انسان را اشرف المخلوقات و اعظم الموجودات مشاہد بدائع صنائع و مظاہر شرایف لطایف خویش فرمودہ......''۔(۱۱)

تاریخی اعتبار سے اس کا ابتدائی حصہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس میں مسلم بادشاہوں سے قبل کے ہندو راجاؤں کے مختصر احوال کو احاطۂ تحریر میں لایا گیا ہے، راجا یدھشٹر سے لے کر عہد اسلامی تک کے ہندو راجاؤں کی حکومت و نظم و نسق اور زندگی کے دیگر اہم شعبوں سے متعلق اختصار کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے لیکن یہ معلومات شک و شبہ پر مبنی ہیں اور بعض بیانات تو ناقابل یقین نظر آتے ہیں۔ اسی لیے محققین نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''......اس میں راجگان ہند اور بالخصوص حکمران دہلی کے نام ان کے ازمنہ حکومت اور مختصر حالات سلطنت مندرج ہیں ......اگرچہ اس زمانے کے واقعات عموماً قصہ و کہانی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے''۔(۱۲)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی کم وبیش اسی قسم کی رائے پیش کی ہے:

''......مغلوں سے پہلے جو سلاطین حکمراں رہے ان کا حال معمولی ہے اور چنداں وقیع نہیں......''۔(۱۳)

کتاب کے اس ابتدائی حصے کی تاریخی اہمیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں مصنف نے ہندوؤں کے آداب و رسوم، طور طریق، رہن سہن اور طرز معاشرت کے سلسلے میں نئے معلومات ہم تک پہنچائے ہیں اس کو ہندو عقائد و روایات سے والہانہ لگاؤ کی وجہ سے وہ ایک سچے قوم پرست کی طرح اپنی قوم کی ایک ایک خوبی کو منظر عام پر لانے کا متمنی دکھائی دیتا ہے اپنے مذہب و قوم کے عقائد تحریر کرتے وقت اس کا لہجہ الگ محسوس ہوتا ہے، ہندو عقائد سے متعلق اس کی معلومات خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

''......خلاصۃ التواریخ کا ابتدائی حصہ زیادہ اہم ہے جس میں ہندو مذہب اور اس کے رسوم وعلوم پر تفصیلی بحث کی گئی ہے......''۔(۱۴)

جب وہ ہندو عقائد بیان کرتا ہے تو اس کے قلم کی روانی میں اور زیادہ شدت آجاتی ہے اس کو اس بات پر ناز ہوتا ہے کہ اس کے اسلاف نے مدت مدید اس ملک پر حکومت کی اور اپنی فہم و فراست سے اس ملک کو رونق و شادابی عطا کی۔

''......ایک اور چیز جو اس کتاب میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے کہ مصنف کے دل میں اپنی قومیت کا زبردست احساس موجود ہے جو باوجود ضبط کے نمایاں ہو کر رہتا ہے......''۔(۱۵)

جس وقت یہ کتاب زیر تصنیف تھی اس وقت پورے ملک پر مغل حکومت تھی چنانچہ مصنف نے صبر و ضبط کو بروے کار لاتے ہوئے اپنی تلخی و تعصب کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی لیکن لہجہ کی سردمہری کو پوشیدہ نہیں رکھ پایا ہے اس کو اس بات کا سخت رنج و ملال ہے کہ اس وسیع و عریض ملک جس پر اس کے آباو اجداد نے حکومت کی وہ اب غیر قوم کے زیر حکومت ہے، جنھوں نے ان کا ملک اپنے زیر تسلط کیا اور دنیا میں ان کے وقار و احترام کو بھی مجروح کیا ہے وہ مسلمانوں کی حکومت کے قائم ہونے اور ان کے تسلط و غلبے کو بیان کرتا ہے تو اپنے تمام تر ضبط کے باوجود اپنے لہجے کی

تلخی و درشتی کو پوشیدہ نہیں رکھ پاتا اور بے اختیار اس کے قلم سے یہ جملے باہر آ جاتے ہیں۔

''...... قادر مطلق جل جلالہ اقتضای آن کرد کہ سلسلہ فرمان روای ہندوستان از فرقہ ہنود کہ از آغاز آفرینش وارث سلطنت ایں مملکت ہستند منقطع گردد و ایں ممالک در ظل راحت جماعۃ مسلمین در آید و در ہندوستان رواج اسلام پدید ارشور سلاطین کہ بہ مذہب و دین و زبان و آئین ہندیان ہیچ بست نداشتند از ولایت دور دست آمدہ بزور بازوی اقبال وقوت سر پنجہ طالع لایزال ایں ممالک راانتزاع کردہ نقش وجود نہود را کہ آبا عجد مسند آرای حکومت و سلطنت بودند باب شمشیر آبدار ز صفحہ روزگار پاک شستند و خرمن ہستی عدوان کہ مخالف مذہب و مدعی سلطنت بودند بہ برق سیف جان ستان خاکستر ساختند''۔(۱۶)

اپنی قوم کی طرح اسے اپنے ملک سے بھی محبت ہے وہ یہاں کی ایک ایک چیز کا نقشہ بڑی تفصیل کے ساتھ رقم کرتا ہے، قصبات و شہر، حسین و خوبصورت مناظر، بلند و بالا عمارتیں، پیڑ پودے، پھل پھول یہاں کی چھوٹی بڑی تمام چیزیں اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہیں اور وہ بے اختیار ان کی تصویر کشی کرتا چلا جاتا ہے چند جملے دیکھیے جو اس نے کشور ہندوستان کی تعریف وتوصیف میں رقم کیے ہیں۔

'' ہندوستان ملکیت وسیع و ولایت دیگر بعشر عشیر آن نرسد باوجود وسعت وفسحت ہمہ جا آباد و در ہر جانب و ہر ضلع امصار و بلاد قصبات و کریات در باطان وقلعہ جات مشتمل بر مساجد و معابد و خوانق وصوامع سایر عمارات دلکشا باغات فرح افزا و شجرات دلکش و زراعات سبز و خوش و جو یبار روان وانہار جریان است کہ در ممالک دیگر ایں نوع آبادی و معموری کمتر نشان می دہند......''۔(۱۷)

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصنف عمدہ مورخ ہی نہیں بلکہ ماہر جغرافیہ داں بھی ہے، اس عہد میں لکھی گئیں دیگر تاریخی کتب میں ہندوستان کے جغرافیائی حالات سے متعلق اطلاعات کم فراہم ہوتی ہیں لیکن سجان رائے ہندوستان کے مختلف علاقوں مثلاً شاہ جہاں آباد، اکبر آباد، اودھ، بہار، بنگالہ، اڑیسہ، اورنگ آباد، مالوہ، اجمیر، گجرات، ٹھٹھہ، ملتان، لاہور، کشمیر اور کابل

وغیرہ کے جغرافیائی حالات ماہرانہ واستادانہ انداز میں بیان کرتا ہے بالخصوص صوبۂ پنجاب سے متعلق معلومات زیادہ ہیں، کیونکہ وہ یہیں قیام پذیر تھا، سجان رائے ایک بہترین قلمی مصور بھی ہے، پھولوں پھلوں، میووں، نہروں، باغوں وغیرہ کی کیفیات کے بیان میں وہ مورخ نہیں بلکہ مصور کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔

> ''...... از رنگا رنگ میوہای ربیع وخریفی با کمال غروبت ولطیفی اگر بتفصیل برنگارو کتابی علیحدہ بایدا گرچہانگور وخرپوزہ وتربوز وانار وسیب وشفتالو وانجیر وغیرہ ذالک بہتر از ولائت می شود اما میوہ مخصوص ہندوستان کہتل درندت بے بدل وتڈہل بحلاوت ضرب المثل وانناس بنوش مزگی وخوشبوی روشناس وکیلا حلوا آلودشریفہ حلاوت اندود ونارجیل عدیم المثال وکونلہ وسنگسرہ درمزہ بی عدیل و کنارشیریں کارست واز کنارصرای چہ نویسد کہ خود رابر ہمہ کس وقف کردہ نہالش دامان صادر و وارد میگیرد واز ثمارات خویش فیض می بخشد ودیگر گونا گوں میوہات کہ بیشمار نیاد...... گونا گوں گلہا بیویا و رنگا رنگ شقایق مطراز گل سرخ کہ آن را گلاب گویند ویاسمیں ونرگس وسوسن ولالہ وزنبق وبنفشہ وریحاں ورعناوزیبا و نافرمان وتاج خروس وقلفہ وعباسی وخطمی وارغوان وصد برگ وداؤدی وغیرہ ذلک آنچہ در ایران وتوران وولایت دیگر می باشد ہمہ درین ملک ست......''۔(۱۸)

دوسرے حصے میں مسلم حکمرانوں کا ذکر ہے۔ سلطان نصرالدین سبکتگین، سلطان شہاب الدین، سلطان ایلتتمش، سلطان علاءالدین مسعودشاہ، سلطان غیاث الدین بلبن، جلال الدین فیروز خلجی، سلطان غیاث الدین تغلق شاہ، فیروز مبارک شاہ، محمد شاہ فیروز، سلطان ناصرالدین، محمد شاہ بن سلطان مبارک شاہ، بہلول لودھی، سکندر لودھی، ابراہیم لودھی، نصیرالدین محمد ہمایوں، شیر شاہ سوری، فیروز شاہ بن اسلام شاہ، ابوالمظفر نورالدین محمد جہاں گیر، ابوالمظفر شہاب الدین شاہ جہاں، ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالم گیر وغیرہ کے سلسلے میں معلومات فراہم ہیں، مغل شہنشاہوں کے مقابلہ میں دیگر شاہوں کے حالات قدرے اختصار کے ساتھ، مغلیہ حکومت کے حالات میں ''اکبرنامہ'' اس کا سب سے اہم ماخذ ہے، حالات شاہ جہانی اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے دیگر تاریخی کتب

کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے، عہد شاہ جہانی کے بعد کے حالات وواقعات غیر معروضی انداز سے پیش کرتا ہے خاص طور پر تخت نشینی کو لے کر بھائیوں کے درمیان جوخونریز جنگوں کواس نے اہمیت دی ہے اور شہزادہ داراشکوہ سے متعلق دلچسپ معلومات دیے ہیں، وہ ان ہی آزاد وخود مختار چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا ذکر کرتا ہے جو براہ راست مرکزی حکومت سے منسلک ہیں۔

''......صوبہ جاتی آزاد حکومتوں کا ذکر مستقل ابواب فصول میں نہیں کیا، بلکہ جس بادشاہ کے عہد میں ان کا الحاق مرکزی حکومت سے ہوا، اس کے ساتھ ہی ضمنی طور پر ان کا بھی مختصر سا تذکرہ کردیا گیا ہے......''۔(۱۹)

یہ کتاب ۱۱۰۷ھ میں مکمل ہوچکی تھی عالم گیراورنگ زیب کی جانشینی تک کے حالات اس میں قلم بند کیے گئے تھے لیکن بعد کے واقعات بھی اس میں شامل ہیں چونکہ مصنف کی تاریخ وفات کا صحیح علم نہیں ہے اس لیے کوئی حتمی رائے نہیں دی جاسکتی کہ یہ مصنف کے اضافہ کردہ ہیں یا کسی اور نے قلم اندازی کی ہے، قرین قیاس یہی ہے کہ یہ واقعات الحاقی ہیں اور کاتب کے اضافہ کردہ ہیں۔

''......بعض قلمی نسخوں کے آخر میں اورنگ زیب کی تاریخ وفات بھی درج ہے جو الحاقی معلوم ہوتی ہے...... یہ عجیب بات ہے کہ اس کتاب میں بعض اوقات ایسے بیانات آجاتے ہیں جن کا تعلق بہت بعد کے زمانے سے ہے مثلاً برٹش گورنمنٹ کا ذکر، کلکتے کی عمارتوں کا ذکر وغیرہ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضامین الحاقی ہیں''۔(۲۰)

یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے، یہ تاریخ ان سطور پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

''القصہ آخرالامر بتاریخ بست وہشتم ذی قعدہ ۱۱۱۸ھ بعد انتظام مہام روز مبارک جمعہ بعد سہ پاس روز حضرت پادشاہ جنت آرام گاہ درعمر نود و یک سال وہفدہ روز دو گھڑی پیمانہ عمر بر یز نمودند مدت سلطنت پنجاہ سال و دو ماہ و بست و ہشت روز در ملک دکن در شہر احمد نگر ایں معنی بوقوع آمد''۔(۲۱)

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں عرق ریزی و جانفشانی سے کام لینے کی سعی بلیغ کی ہے، بظاہر یہ تاریخ حکمران وقت کی ایما پر یا کسی صلے کی طمع میں نہیں لکھی گئی اس

لیے آزادانہ رائے اور تنقیدی بصیرت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ بقول سید عبداللہ:

''...... سجان رائے میں آزادی اور دیانت کا جوہر معلوم ہوتا ہے......''۔(۲۲)

اس کتاب کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں عہد اورنگ زیب سے متعلق جو معلومات قلم بند کیے گئے ہیں مصنف ان کا چشم دید گواہ ہے اس نے متعدد خونی واقعات اور روح فرسا حالات کا مشاہدہ و محاسبہ کیا ہے۔

کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو فارسی زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے اسلوب نگارش رنگین و پیچیدہ ہے اس نے اپنی انشاء پردازی اور طرز تحریر کا جادو بھی جگایا ہے جو ہمارے بعض اہل نظر کے نزدیک زیادہ مستحسن نہیں لیکن عہد سجان رائے پیش نظر ہو تو مرصع و مسجع و مقفع نثر مقتضائے زمانہ ہے، عبارت کو رنگین و دلکش بنانے کی غرض سے استعارات و کنایات نے تاریخ کو بوجھل نہیں بلکہ خوبصورت و رنگین بنادیا ہے۔

''مصنف نے کتاب کو پاکیزہ و رنگین عبارت فارسی میں لکھا ہے اور استعارات و کنایات و اشعار برمحل و موقع سے اس کو زیب و زینت دی ہے''۔(۲۳)

یہ جامع و مانع تاریخ، عوام و خواص دونوں ہی کے لیے یکساں مفید اور کارآمد ہے۔

حواشی

(۱) حکیم نثار احمد علوی، سخنوران کاکوری، ص ۳۱، شیخ شوکت علی پرنٹرز کراچی ۱۹۷۸ء۔ (۲) محمد قاسم فرشتہ ترجمہ عبدالحیٔ، تاریخ فرشتہ، ص ۳۹، مکتبہ ملت دیوبند۔ (۳) اقتدار حسین صدیقی، اردو میں تاریخ نگاری کی ابتداء، ص ۱۷۱، پرنٹو لوجی نئی دہلی ۲۰۰۸ء۔ (۴) گردھاری لعل مصحح حسین، تلمذ۔ دیباچہ تاریخ ظفرہ، ص ۴، حکیم برہم گورکھپوری ۱۹۲۷ء۔ (۵) ڈاکٹر سید جمال الدین، تاریخ نگاری قدیم و جدید رجحانات، ص ۱۴، لبرٹی آرٹ پریس، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء۔ (۶) سجان رائے مصحح ظفر حسن، مقدمہ خلاصۃ التواریخ، ص ۶، جی اینڈ سنس، دہلی، ۱۹۱۸ء۔ (۷) ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ص ۸۶، ثمر آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی، ۱۹۹۲ء۔ (۸) سجان رائے مصحح ظفر حسن، خلاصۃ التواریخ، ص ۸، جی اینڈ سنس،

دہلی، ۱۹۱۸ء۔(۹) ایضاً،ص ۸-۹۔(۱۰) ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ،ص ۸۶۔ (۱۱) سجان رائے مصحح ظفر حسن، خلاصۃ التواریخ،ص ۱۔(۱۲) ایضاً ص ۶۔(۱۳) ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ،ص ۸۹۔ (۱۴) ڈاکٹر نورالحسن انصاری، فارسی ادب بعہد اورنگ زیب،ص ۴۷۷، کوہ نور پریس، دہلی ۱۹۶۹ء۔ (۱۵) ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ۔ (۱۶) سجان رائے مصحح ظفر حسن، خلاصۃ التواریخ،ص ۱۶۰۔(۱۷) ایضاً،ص ۹۔(۱۸) ایضاً،ص ۱۱-۱۳۔ (۱۹) ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ،ص ۸۹۔(۲۰) ایضاً۔(۲۱) سجان رائے مصحح ظفر حسن، خلاصۃ التواریخ،ص ۵۳۸۔ (۲۲) ڈاکٹر سید عبداللہ، ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ،ص ۹۱۔(۲۳) سجان رائے مصحح ظفر حسن، خلاصۃ التواریخ،ص ۶۔

اخبار علمیہ

خانہ کعبہ کا مینار ساعت (گھڑی مینار)

''امارات نیوز'' کے مطابق بیت اللہ شریف کے سامنے ایستادہ کلاک ٹاور اس وقت دنیا کے بلند ترین میناروں میں دوسرے نمبر پر ہے لیکن اب اس کی چھت پر جدید سونے کے مینار کی وجہ سے اس کو اولیت کا درجہ حاصل ہوگیا ہے، کچھ عرصہ پہلے تک دنیا کا سب سے بلند مینار تائیوان کا ''تائی پائی'' ٹاور تھا جس کی اونچائی ۵۰۹ میٹر تھی لیکن دبئی کے ۸۲۸ میٹر بلند برج الخلیفہ اور ۶۰۱ میٹر بلند مکہ مکرمہ کے کلاک ٹاور کی تعمیر کے بعد یہ افتخار مشرق وسطیٰ کی عرب ریاستوں کو حاصل ہوگیا ہے، اخبار عکاظ کی خبر ہے کہ اس کے ذریعہ پورے شہر میں اذان و اقامت کی آواز کے ساتھ روشنی پہنچانے کا انتظام بھی کیا جائے گا، مینار کے چہار جانب لاؤڈ اسپیکر ہیں، ایک طرف ۱۶ ہائی بیم لائٹ ہے جس کی روشنی دس کلومیٹر تک اجالے بکھیر سکتی ہے، اس کے علاوہ ۲۱ سو مختلف قسم کی روشنیوں کا اہتمام کیا گیا ہے جن سے حرم مکی سے ۳ کلومیٹر کا پورا علاقہ دودھیا اور سبز روشنی کے ذریعہ بقعۂ نور بن جائے گا، اس کلاک ٹاور کی تعمیر کا ایک مقصد GMT کے مقابلہ میں ایک اور نیا آلۂ وقت متعارف کرانا ہے جو مستقبل میں عالمی پیمانہ پر وقت کے تعین میں مددگار ہوگا۔

''نیوز آف دی ورلڈ''

صحافت کی دنیا میں یہ خبر خوب پھیلی کہ ۱۶۸ برس قدیم ہفت روزہ ''نیوز آف دی ورلڈ'' جیسے کثیر الاشاعت اور مقبول عام اخبار کو بند کردیا گیا، دس جولائی کو شائع ہونے والا شمارہ آخری تھا، اس میں تجارتی اشتہار کے بہ جائے فلاحی اداروں کے مفت اشتہارات شائع کیے گئے لیکن اس سے وابستہ دو سو صحافیوں کو بھی بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا، ابتدا میں تو یہ کچھ کمال نہ دکھا سکا لیکن ۱۹۶۹ء میں مرڈوک نے اس میں سنسنی خیز خبریں شائع کرکے اس کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا، ہر ہفتے اس کی تیس لاکھ کاپیاں شائع ہوتی تھیں، اس کے بند ہونے کی وجہ ٹیلی فون ہیکنگ اسکینڈل اور بعض غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکتوں کا ارتکاب ہے، اصل قصورواروں کے ساتھ بے قصوروں کو سزا ملنے پر دنیائے صحافت سراپا احتجاج ہے۔

''نایاب معدنیات''

اب تک الیکٹرانک کاروں، فلیٹ اسکرین، آئی پیڈ اور اس قسم کی دوسری چیزوں میں استعمال ہونے والی نایاب معدنیات کا سب سے بڑا مخزن ومصدر چین تھا یعنی قریب ۹۷ فیصد اس قسم کی معدنیات چین ہی سے دنیا کو حاصل ہوتی تھیں، لیکن جاپانی محققین نے جزیرہ جاپان اور تائیوان کے مابین سمندروں میں ان نایاب معدنیات کی ۱۰۰ بلین ٹن کی مقدار کا انکشاف کرکے چین کی اس بالادستی پر پانی پھیر دیا ہے، رپورٹ کے مطابق یہ ذخائر ساڑھے تین سے چھ ہزار میٹر تک گہرے اور گیارہ ملین مربع میٹر تک پھیلے ہوئے ہیں، اس بیش قیمت ذخیرہ کو اب جاپان نکالنے میں مصروف ہے، اس خبر نے چینی ماہرین اقتصادیات وسیاسیات کو بے چین کردیا ہے۔

''مسجد الفاروق'' دبئی

خلیج ٹائمز کی اطلاع کے مطابق دبئی میں استنبول کی افسانوی نیلی مسجد کے طرز پر مسجد الفاروق بنائی گئی ہے، ۴۲۰۰ مربع میٹر کے اس کے وسیع وعریض ہال میں ۲ ہزار مصلیوں کی گنجائش ہے جب کہ پوری مسجد ۸۷۰۰ مربع میٹر پر محیط ہے اور اب دبئی کی سب سے بڑی مسجد ہونے کا اس کو شرف حاصل ہے، اس میں نصب ٹائلس پر مراکشی دست کاروں کی دست کاری اور خطاطوں کی خطاطی کا مظاہرہ دیدنی ہے، دیواروں پر چسپاں خاص ٹائلس میں قرآنی آیات منقش ہیں، مرکزی گنبد ۳۰ میٹر بلند ہے اور چھوٹے چھوٹے ۲۱ گنبد ہیں، عمارت کی شان وشوکت مغل بادشاہوں، عثمانی سلاطین اور فردوس گم گشتہ اندلس کی یاد تازہ کردیتی ہے، مسجد سے ملحق ایک درس گاہ اور چار ہزار کتابوں پر مشتمل ایک عمدہ کتب خانہ بھی ہے، بین المذاہب مذاکرات کے لیے ایک لکچر ہال بھی تعمیر کیا جائے گا۔

''فتاوی رضویہ''

مولانا احمد رضا خاں، بریلوی مکتب فکر کے بانی اور ہندوستان کے مشاہیر علماء میں ہیں، مختلف علوم اسلامیہ کے علاوہ فقہ حنفی میں ان کو یدطولی حاصل تھا، دمشق کے ایک عالم شیخ مہربان باروہی کی اطلاع ہے کہ بیروت کے عالمی شہرت یافتہ اشاعتی ادارہ دارالکتب نے ''فتاوی رضویہ'' کی

تمام جلدوں کا مکمل عربی ایڈیشن شائع کیا ہے، اس سے قبل بھی اس ادارہ نے کرنسی نوٹ کے موضوع پر ان کی عربی کتاب ''کفل الفقیہ'' شائع کی تھی، مقبولیت کے سبب فتاوی رضویہ کے انگریزی ترجمے کی کوشش بھی شروع ہوچکی ہے، اردو کی متعدد ویب سائٹوں پر بھی ''فتاوی رضویہ'' دستیاب ہے۔

''نوادرات''

سعودی عرب کے علاقہ ''المحز'' میں کھدائی کے دوران ۹ ہزار سال پرانے نوادر برآمد ہوئے ہیں، سعودی کمیشن برائے سیاحت و نوادر کے صدر نشین پرنس سلطان بن سلمان اور آثار قدیمہ کے ارکان نے شاہ عبداللہ کو اس کی تفصیلات بہم پہنچاتے ہوئے کہا کہ کھدائی کے نتائج کو عام کیا جائے گا تاکہ سعودی عرب کی قدامت اور اس کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کے یہ گوشے بھی سامنے آئیں، ان آثار و باقیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب نو ہزار برس قبل بھی گھوڑوں میں دلچسپی رکھتے تھے، جو آج تک برقرار ہے، عربوں کی شہسواری کے یہ مشاہد بڑے دلکش ہیں ان آثار قدیمہ کی دریافت نے یہ بھی بتایا کہ ''المحز'' دنیا کی قدیم ترین بستیوں میں سے ہے جہاں کبھی انسان تہذیبی لحاظ سے ممتاز و نمایاں تھا۔

''کافی مشین سے بجلی کی پیدائش''

ابوظبی کی فیوجرانرجی کمپنی نے کافی مشین سے بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا ہے، تفصیل کے مطابق کمپنی نے شمسی توانائی کو استعمال کرنے والی ٹکنالوجی کا اس میں سہارا لیا ہے، مدار انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹکنالوجی کے سربراہ کا بیان ہے کہ اس مشین کے ذریعہ اس بات کو سمجھنے میں مدد مل رہی ہے کہ شمس ون کو کتنی توانائی مل رہی ہے، شمس ون سو میجر میگا واٹ بجلی کی فراہمی کا منصوبہ ابھی تیاری کے مراحل میں ہے، اس کے تحت ۲۰۱۲ء تک شہر میں ایک لاکھ افراد کو بجلی فراہم کی جائے گی، یہ کافی مشین جدید ٹکنالوجی سے آراستہ ہے، اس کے وسط میں نصف لیٹر پانی کی ٹیوب نصب ہے، مشین کے بیرونی جانب آئینہ لگایا گیا ہے اور یہی آئینہ سورج کی روشنی سے توانائی کا حصول اور اسے حرارت میں بدلنے کا کام کرتا ہے، ٹیوب کا پانی شمسی توانائی سے تیزی کے ساتھ گرم ہونا شروع ہوتا ہے جس سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔

ک، ص اصلاحی

وفیات

ڈاکٹر شانتی سروپ

ڈاکٹر شانتی سروپ بڑی خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہوگئے، شخصیت پر نام اگر اثر انداز ہوتا ہے تو ڈاکٹر صاحب اس کا ایک سچا نمونہ تھے، سکوت وسکون کا پیکر، ہمیشہ ریشم وشبنم کی طرح بزم اور صہبا ونسیم کی مانند خراماں۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے زمانہ میں وہ اکثر دارالمصنّفین آتے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم سے بھی یہی تعلق رہا، کبھی کبھی وہ اس خاکسار کے کمرے میں بھی تشریف لاتے اور یہ صرف اس وضع داری کے پاس میں جس پر وہ برسوں سے عمل پیرا تھے، ہمارے یہ دونوں بزرگ ان کا جس عزت ومحبت سے استقبال کرتے اس سے اندازہ ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب فضل وکمال کی نعمت سے مالا مال ہیں اور جب برسوں پہلے ان کو دارالمصنّفین کا رفیق اعزازی بنایا گیا تو یہ احساس اور قوی ہوگیا کیوں کہ دارالمصنّفین کی تاریخ میں وہ پہلے غیر مسلم تھے جن کو اس علمی اعزاز سے نوازا گیا۔

مدت سے ان کی آمد کا یہ سلسلہ موقوف رہا اور جب ان کی خبر ملی تو اس طرح کہ وہ اس دنیا میں چلے گئے جہاں سے اب کبھی واپس نہ آئیں گے۔

ان کا ذکر چلا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے بڑی خاموشی سے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علمی انہماک میں گزارا، خاص موضوع ہندوستان کی ثقافتی تاریخ تھا، جس میں انہوں نے کئی ایسی کتابیں مرتب کیں جو اپنے موضوع پر گہرے مطالعہ اور سچے تجزیے کی وجہ سے ہندوستان اور باہر کے ملکوں میں قدر ومنزلت کے ساتھ قبول کی گئیں، جیسے آرٹس اینڈ کرافٹس آف انڈیا اینڈ پاکستان، ۵۰۰۰ برس آف انڈیا آرٹس اینڈ کرافٹس آف انڈیا اینڈ پاکستان، فلورا اینڈ فونا ان مغل آرٹ، مغل آرٹ اے اسٹڈی ان ہینڈی کرافٹس، اس کے علاوہ سری لنکا کی سنہالی انسائیکلو پیڈیا میں اسی موضوع پر ان کا مفصل مقالہ شائع ہوا، وکٹوریہ اینڈ رابرٹ میوزیم نے بھی ان کے ایک تحقیقی مقالہ کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔

ہندوستان کی قدیم ثقافت خصوصاً مسلم دور حکومت میں فنون کی ترقی اور تہذیب وثقافت کے

غیر معمولی ارتقاء کے متعلق یہ بات مخفی نہیں کہ مغربی خصوصاً انگریز اہل قلم نے اس پوری سیاسی اور ثقافتی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا، برطانوی دور حکومت میں یہ احقاق حق آسان بھی نہیں تھا، لیکن آزادی ہند کے بعد غیر جانب داری اور انصاف کی نظر سے تاریخ ہند کا مطالعہ کا جو ماحول تیار ہوا، ڈاکٹر شانتی سروپ اس کی بہترین مثال بنے، تاریخ کی صداقتوں کے وہ متلاشی رہے، ۵۰۰۰ برس آف آرٹس اینڈ کرافٹس میں انہوں نے مبسوط و مفصل تحریر میں جہاں مجسمہ سازی، تعمیر، مصوری، رقص، موسیقی، دستکاری وغیرہ موضوعات پر سیر حاصل بحث کی اور ہندوستان کے عہد قدیم سے مغل دور تک کی خصوصیات پر روشنی ڈالی، وہیں انہوں نے مسلمانوں کے دور حکومت کو ہندوستانی ثقافت کے ارتقاء میں اپنے عدیم المثال اثرات کی وجہ سے عظیم ترین سرمایہ قرار دیا، انہوں نے ثابت کیا کہ ہندوستانی فنون جمیلہ محض انفرادی ذوق کا آئینہ نہیں بلکہ ہر صاحب فن نے اپنے معاشرے کے نظریات وتخیلات اور اخلاقی اقدار و روایات کا احترام بھی ہمیشہ مدنظر رکھا، سلامت ذوق اصابت نظر کی یکسانی نے ہی غالباً ان کو دارالمصنّفین سے قریب کیا، بزم تیموریہ، بزم مملوکیہ اور تمدنی جلوؤں نے ان کو تہذیبی تاریخ کی تالیف میں فراخ دلی اور وسعت نظر کی وہ سوغات دی جس نے دارالمصنّفین سے ان کی قربت کو ہمیشہ استوار رکھا اور خود ان کی شخصیت میں وہ جاذبیت اور کشش پیدا کی جس سے مشترکہ تہذیبی رویوں کی شناخت قائم وظاہر ہوکر رہتی ہے۔ ویسے بھی وہ اعظم گڈہ کے اس معاشرے سے تعلق رکھتے تھے جس کو مشترکہ تہذیبی روایت نے انفرادیت بخشی تھی، ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے اور اس وقت وکالت کے پیشے سے اعظم گڈہ کے معروف مسلم خاندانوں کے زیادہ تر افراد بھی وابستہ تھے، خود علامہ شبلی کے اہل خاندان کے لیے یہی پیشہ ذریعہ معاش تھا اور وسیلۂ شرف بھی۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک چچا بھی نامور وکیل، دوسرے چچا ماہر تعلیم اور تیسرے زرعی سائنس داں تھے، ان کا دولت خانہ چندر بھون واقعی خانہ قمر تھا جہاں جواہر لال نہرو اور شیاما پرشاد مکرجی کا نزول ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اعلیٰ تعلیم، وکالت ہی کی حاصل کی، الٰہ آباد یونیورسٹی نے انہوں نے گرچہ تاریخ میں ایم اے کیا لیکن بالآخر انہوں نے ایل ایل بی کا کورس کیا، ۴۳ء میں انہوں نے وکالت شروع کی لیکن وہ خود کہتے تھے کہ وہ وکالت سے کبھی ہم آہنگ نہ ہوسکے، تاریخی مطالعات کے جس شوق کی آبیاری، رابندر ناتھ ٹیگور، سبھاش چندر بوس، راجندر پرشاد، امرتا شیرگل اور مولانا آزاد کے افکار وتوجیہات سے ہوئی تھی، وہ پروان چڑھتا ہی رہا، ان

کے مضامین مسلسل موقر انگریزی رسائل میں شائع ہوتے رہے اور ۷۵ء میں جب ان کی پہلی کتاب آرٹس اینڈ کرافٹس شائع ہوئی تو بین الاقوامی سطح پر اس کی ستائش ہوئی، ڈی اے وی کالج میں انہوں نے شعبہ تاریخ قائم کیا، ۶۲ء میں وہ صدر شعبہ ہوئے، اس کے باوجود علم بلکہ کمال کی طلب کا یہ عالم تھا کہ اکسٹھ سال کی عمر میں انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، یہ مقالہ ۸۴ء میں فلورا اینڈ فونا ان مغل آرٹس کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا، مغلوں کے فنون لطیفہ میں مناظر فطرت سے شیفتگی کی بے شمار دلکش ترین مثالیں تعمیرات، مصوری، خطاطی میں موجود ہیں جن کا حسن واقعی مسحور کن ہے مگر شانتی سروپ صاحب نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے مورخین فنون نے اس کے اظہار واعتراف میں بخل سے کام لیا اسی احساس نے ان کو اس مقالہ اور کتاب کی ترغیب دی۔ یہ ان کی پاک نیت کا اثر اور ثمر تھا کہ ان کی کاوشوں کو قدر و قبول سے نوازا گیا، ان کو انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کی باوقار فیلوشپ ملی، برٹش کونسل نے ان کو وزیٹنگ اسکالر کی حیثیت سے برطانیہ مدعو کیا، جہاں انہوں نے مغل آرٹ دے اسٹڈی ان ہینڈی کرافٹس جیسی بلند پایہ دستاویزی کتاب مرتب کی جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی، پیرانہ سالی میں مسلسل مطالعہ و تحقیق سے ان کی بینائی گویا جاتی رہی، ۹۹ء میں ان کی اہلیہ جو ایکن نواز ہونے کے ساتھ بڑی علم نواز اور شوہر کے علمی کاموں میں سچی شریک حیات تھیں اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو شانتی سروپ صاحب بھی ٹوٹ کر رہ گئے، اعظم گڈھ میں قیام اہلیہ کی وجہ سے تھا، ایک بیٹا ارون سروپ دہلی میں اور ایک بیٹی شاچی رنجن ممبئی میں بس چکے تھے، شانتی سروپ کی زندگی ان دونوں دوریوں میں بٹ کر رہ گئی، اعظم گڈھ چھوٹ گیا لیکن اس کی یادیں زندہ رہیں، چند برس پہلے یادوطن کی کشش ان کو ایک بار پھر اعظم گڈھ کھینچ لائی، آئے تو چندر بھون کے ساتھ شبلی منزل پر بھی الوداعی نظر ڈالی، رخصت ہوئے اور ۹۴ سال کی عمر میں یکم نومبر ۲۰۱۰ء میں اس دنیا کو بھی خیر باد کہہ دیا، زندگی خاموشی اور شانتی سے گزاری، موت بھی اسی شان سے آئی، بہتوں کو خبر بھی نہ ہوئی، جس ادارے کے وہ اعزازی رفیق ہوئے خود اسی کو علم و تحقیق کے اس نقصان کا احساس دیر سے ہوا، خودنمائی سے ان کے پرہیز کا یہ عالم تھا کہ ان کی کسی کتاب میں مختصراً بھی ان کی اپنی ذاتی زندگی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی، برادر محترم پروفیسر جاوید علی خاں صدر شعبہ تاریخ شبلی کالج اور رفیق اعزازی دارالمصنفین کی توجہ سے ان کے حالات دستیاب ہوئے، یہ تحریر اس کے لیے ان کی مرہون منت ہے۔

ع-ص

مطبوعات جدیدہ

حیات ابوالمآثر (جلد ثانی): از ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۷۵۸، قیمت درج نہیں، پتہ: مرکز تحقیقات و خدمات علمیہ، مرقاۃ العلوم، پوسٹ بکس نمبر ۱، مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱، یوپی۔

قریب دس سال پہلے محدث کبیر و شہیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی سوانح عمری شائع ہوئی تھی، اس میں ان کی زندگی کے حالات و واقعات جمع کیے گئے تھے، نجی زندگی کی تفصیلات کی اہمیت کم نہیں لیکن سوانح کی اصل افادیت صاحب سوانح کی عملی زندگی سے ہے اور یہی مقصود اصلی ہے، حضرت اعظمیؒ کی زندگی اصلاً علوم اسلامیہ خصوصاً حدیث شریف کی خدمت سے عبارت ہے اور یہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے لیے ایک جدا دفتر کی ضرورت ہے، زیر نظر کتاب اس ضرورت کی بہترین تکمیل ہے جس میں تفسیر و حدیث، فقہ و افتا، تاریخ و تذکرہ، زبان و ادب، فلسفہ و کلام، تصوف و ہیئت جیسے موضوعات پر مولانائے مرحوم کی عربی، فارسی اردو تصانیف، تراجم، مقالات غرض ہر تحریری نقش کو اجاگر کیا گیا، ان کے مخطوطات و مسودات کی نشان دہی کی گئی اور یہ سب اس سلیقہ کے ساتھ کہ گویا قاری کے لیے علوم اسلامیہ کی ایک انسائیکلوپیڈیا سامنے آگئی، دفاع حنفیت، مولانا مرحوم کی علمی زندگی کا اہم باب ہے، قدرتاً اس باب میں ایسے مسائل پر دلچسپ اور چشم کشا مباحث ہیں جن کے ذکر سے ہندی مسلمانوں کا مذہبی معاشرہ آج بھی پرشور ہے، لیکن ردشیعیت، ردبدعات، ردانکار حدیث جیسے مباحث بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اس کے علاوہ علمی و تحقیقی نگارشات کے چند منتخبات جیسے ''ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات، مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے، الذخائر والتحف، غریب الحدیث'' وغیرہ معلومات کا خزینہ ہیں، تخریج زیلعی اور زجاجۃ المصابیح کا تعارف اور اس پر مولانا کے تبصرے ان کی غیر معمولی نظر کا ثبوت ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات پر مولانا اعظمی نے چند اشعار کہے تھے اور تاریخ وفات بھی نکالی تھی، مصنف عبدالرزاق، مسند حمیدی، سنن سعید ابن منصور اور الحادی جیسی کتابوں کے مرتب، محقق اور تعلیق نگار کی یہ شاعرانہ صلاحیت قابل حیرت ہے، بعض اشعار پر یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ یہ وزن سے ساقط ہیں، اس کے متعلق مولانائے مرحوم نے ایک خط میں بحر رمل مسدس محذوف اور بحر سریع مطوی

موقوف کے فرق کو جس طرح واضح کیا یہ ان کی عبقریت کا مظہر ہے۔ان کی عربی تصنیفات وتالیفات کے متعلق بھی مکمل معلومات دیے گئے ہیں۔الحاوی لرجال الطحاوی کے نام سے انہوں نے شرح معانی الآثار اور شرح مشکل الآثار دونوں کتابوں کے رجال و رواۃ کو جمع کیا، لائق مرتب نے اس غیر مطبوعہ کتاب کی چند جھلکیاں اس سلیقہ سے پیش کی ہیں کہ کتاب کی طباعت کا اشتیاق دو چند ہو گیا ہے۔شیخ ناصر الدین البانی کی شہرت علم حدیث کے جدید شیخ وامام کی ہے، مولانا اعظمی نے ان کی بعض غلطیوں اور مسامحات کی نشان دہی کی، چار اجزاء میں الالبانی شذوذہ واخطاءہ کے نام سے یہ کتاب شائع ہوئی تو مولانا کی وسیع ودقیق نظر کا اعتراف کیا گیا، مولانا اعظمی کے کارناموں میں مصنف عبدالرزاق کی تحقیق بھی شامل ہے، کتاب کی اشاعت کے بعد جامع عبدالرزاق یا جامع معمر کے عنوان سے ایک علمی قضیہ سامنے آیا، اس قضیہ کی پوری تفصیل بھی پیش کی گئی ہے، غرض یہ کتاب محدث شہیر کی علمی زندگی کا جامع ترین مرقع بن گئی ہے، علماء اور علوم نبوت کے طلبہ کے لیے اس کے مطالعہ میں افادیت ہی افادیت ہے، آغاز میں محدث کبیر کے صاحب زادے مولانا رشید احمد اعظمی کے علاوہ مولانا محمد یحییٰ ندوی اور پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحمٰن مومن کی معلومات افزا تحریریں ہیں ان پر مستزاد لائق مصنف کا مبسوط مقدمہ جس میں گویا پوری کتاب کا عطر آ گیا ہے، البتہ مولانا محمد یحییٰ ندوی کی نہایت موثر اور البیلی تحریر میں نظر اس جملے پر ٹھٹکی ''خدا بخش لائبریری، حضرت اعظمی کی علمی چراگاہوں میں سے ایک تھی'' اتفاق سے مولانا ندوی سے گفتگو کا موقع ملا انہوں نے بڑی صراحت سے فرمایا کہ یہ جملہ غلطی سے آ گیا اور یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ایران کی چند اہم تفسیریں (جلد سوم): از ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۴۴، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: قرطاس، پوسٹ بکس نمبر ۸۴۵۳، کراچی، پاکستان۔

ہندوستان کے ایران شناسوں میں جناب جائسی کا نام جس طرح 'بڑا' ہے اسی طرح ایرانیات سے روشناسی کا کام بھی 'قابل تعریف' ہے، زیر نظر کتاب شناسی و روشناسی کے اس مسلسل عمل کا حصہ ہے جس میں ایران کے تفسیری ادب سے اردو دنیا کو غالباً پہلی بار متعارف کیا گیا، اس کا آغاز محمد بن جریر طبری کی تفسیر جامع البیان سے ہوا تھا، دوسری جلد میں تفسیر نسفی اور روض الجنان وروح الجنان وغیرہ تفسیروں کا ذکر تھا، زیر نظر تیسری جلد میں پانچ اور تفسیروں اسرار الفاتحہ، حدائق حقائق، تفسیر شاہی،

منہج الصادقین اور تفسیر لاہیجی کا ذکر ہے، زمانی لحاظ سے یہ تفسیریں گیارہویں صدی ہجری یعنی صفویوں کے عہد کے خاتمہ تک کی ہیں، اسرار الفاتحہ، معین الدین فراہی ہروی کی محنت کا نتیجہ ہے، فاضل مصنف نے فراہی ہروی کے قدرے طویل تعارف میں ان کی تفسیری شناخت کے ساتھ یہ خلش ظاہر کی کہ اگر چہ وہ ہروی سنی نظر آتے ہیں مگر ان کی مخصوص مزاجی کیفیت کسی اور چیز کی غمازی کرتی نظر آتی ہے، اس کے لیے انہوں نے فارسی ادب کے طلبہ کو متوجہ کیا ہے لیکن جب ہروی کے اسرار کو انہوں نے بیان کیا تو اہل اشارت کی بشارت کے ذریعہ سورہ فاتحہ کے حروف کی تعداد جس طرح بیان کی گئی وہیں سے فاضل مصنف کی خلش دور ہونے لگتی ہے، خود ہی لکھتے ہیں کہ ''ہروی کی بات بشارت ہے یا شیطانی دغدغہ یا وسوسہ......اس بات کا ضرور ثبوت مل جاتا ہے کہ ہروی، دور کی کوڑی لانے کے فن میں ماہر تھے''، فاضل مصنف نے ان تفسیروں کی جھلکیاں پیش کرنے میں عافیت کو پیش نظر رکھا ہے لیکن نازک موقعوں پر وہ مترجم یا پیش کنندہ کی ذمہ داری بھی نبھاتے اور لکھتے ہیں کہ روایتوں کے ماخذ کا ذکر مفسر نے کیوں نہیں کیا، رطب و یابس روایات کو بے حوالہ نقل کیا گیا ہے تو مفسر کے بیان پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں' جائسی صاحب کا یہ کہنا کہ چند نمونوں سے پوری تفسیر کے مطالعہ کا حق ادا نہیں ہوتا، تاہم نویں صدی ہجری کے ایرانی ماحول میں اس قسم کی تفسیروں کی تصنیف اپنے پس منظر کو زیادہ واضح کرتی نظر آتی ہے، حدائق الحقائق بھی ہروی کی تفسیر طرازی کا نمونہ ہے، جائسی صاحب نے سورہ یوسف کی ہروی تفسیر کو پیش کیا ہے اور یہ اسرار فاتحہ کی طرح کم پر اسرار نہیں، تفسیر شاہی کا تعارف بھی خاصا طویل ہے اور مصنف کے اس قول پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے کہ ''یہ کسی خاص ندرت یا جدت کی حامل نظر نہیں آتی''، بہر حال ان تفسیروں کے تعارف سے اتنا ضرور ہوا کہ قرآن مجید کے مطالعہ کے بعض پہلو ایسے سامنے آ گئے جن سے اردو تفسیروں کے قاری عموماً لاعلم اور نامانوس ہیں۔

مقالات حبیب (حصہ اول، دوم، سوم): از مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات بالترتیب ۳۶۸، ۳۵۲، ۴۴۰، قیمت درج نہیں، پتہ: شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند، یوپی۔

موجودہ علمائے دیوبند کے اصحاب قلم میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا نام سرفہرست ہے، استاذ حدیث اور ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے مدیر دونوں حیثیت سے وہ ایک مدت سے علم و قلم کی مبارک

خدمت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، موضوعات کے تنوع اور کثرت کے باوجود ان کی تحریروں کی ثقاہت واستناد پر حرف نہیں آتا، ان کی بعض کتابیں تو مرجع ومصدر کا درجہ رکھتی ہیں، زیرنظر تین جلدوں میں ان کے مضامین ومقالات یکجا کیے گئے ہیں، اگر ان کے موضوعات ہی کو یہاں نقل کیا جائے تو صفحات درکار ہوں گے، مثلاً پہلی جلد تین ابواب یعنی ہندوستان میں احیائے علم وفکر، صحابہ کرامؓ کی عظمت شان اور فرق باطلہ کے تعاقب پر مشتمل ہے، اس کے ذیل میں سینکڑوں عنوانات ہیں، اسی طرح حصہ دوم مسائل ودلائل کے تعلق سے اور تیسری جلد گوشہ سیرت وتاریخ اور تذکرہ ارباب فضل وکمال کے لیے خاص ہے اور ان میں بھی بے شمار مباحث آگئے ہیں، موضوعات میں تنوع ہے لیکن تحریر کی سلاست اور شگفتگی ہر جگہ یکساں ہے، قاری جس سطح کا بھی ہو یہ تحریریں اس کے لیے دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں اور سچ کہا گیا کہ اس میں پڑھنے والے کو بڑے کام کے نقطے اور نکتے مل جاتے ہیں، ان تین جلدوں کا مطالعہ بڑی بڑی کتابوں سے بے نیاز تو نہیں کرتا لیکن کم وقت میں معلومات کی کمی کا شکوہ بھی نہیں کرنے دیتا، کتاب پر بعض مشاہیر دیوبند کی رائیں ہیں جو ادبی فتاوی سے کم نہیں، خصوصاً مولانا نور عالم امینی کی تقریظ، ایسی تحریض ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد مقالات حبیب کی محبت اور فزوں ہو جاتی ہے۔

ہندو کبھی نہ بننا: از ڈاکٹر اے سپن، ترجمہ ڈاکٹر الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۹۶، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱- حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

تمل ناڈو کے ڈاکٹر اے سپن نے زندگی کی ایسی داستان سنائی جو انسانوں پر انسانوں کے جبر، ظلم، تذلیل اور تحقیر کی نہایت دل خراش کہانی تھی، جب ایک تعلیم یافتہ انسان اپنی پیدائش کو بدقسمتی تصور کرے بلکہ ایک پورے طبقہ کے وجود کو بدنصیبی سے تعبیر کرے تو یہ انسانیت کے وجود کے لیے واقعی بدقسمتی ہے، لیکن سپن کے دلت طبقہ کی مجبوری ومحرومی کی یہ داستان اس وقت اور عبرت کا سبب بنتی ہے جب محسوس کیا اور کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایسے طبقے ہیں جو دلتوں جیسے مسلمانوں سے ویسا ہی سلوک کرتے ہیں جیسا دلتوں سے ان کے ہم مذہب روا رکھتے ہیں، ڈاکٹر سپن کی اس کتاب میں دین حق اور علمبردار مساوات مذہب کے ماننے والوں کے لیے بہت کچھ ہے، یہ اصلاً انگریزی میں تھی، ہندی میں ترجمہ ہوا اور اس کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ یہ اردو میں بھی آجائے، لائق مترجم نے بڑے سلیقہ سے یہ کام انجام دیا، ان کا قلم رواں ہے اور اس میں برکت بھی ہے۔ یہ کتاب اسی کا ثبوت ہے۔ ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱- **ابوالحسن علی الندوی**، سید عبدالماجد الغوری، دار ابن کثیر، دمشق بیروت، قیمت درج نہیں۔

۲- **النزعات الجدیدۃ فی النثر الادبی العربی بعد الحرب العالمیۃ الثانیہ، قسم اللغۃ العربیہ وآدابہا**، جامعہ علی کرہ الاسلامیہ علی کرہ، الہند۔ قیمت درج نہیں۔

۳- **حرکۃ الترجمہ فی العصر العباسی**، اورنگ زیب اعظمی، دار الحرف العربی، بیروت لبنان، قیمت درج نہیں۔

۴- **الادب المغاربی فی القرن العشرین**، ڈاکٹر محمد اقبال حسین، المعہد المرکزی للغۃ الانجلیزیہ واللغات الاجنبیہ، حیدرآباد، قیمت ۲۲۵ روپے۔

۵- **محمد حمید اللہ سفیر الاسلام وامین التراث الاسلامی فی الغرب**، سید عبدالماجد الغوری، دار ابن کثیر، دمشق بیروت، قیمت درج نہیں۔

۶- **گجرات کی علمی وادبی شخصیات**، مولانا مفتی احمد دیولوی، علامہ محمد بن طاہر پٹنی اکیڈمی، جامعہ علوم القرآن جمبوسر، بھروچ، گجرات، قیمت درج نہیں۔

۷- **ڈیلی وژڈم، سلیکشنس فرام دی ہولی قرآن**، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، کوبے پبلشنگ لمٹیڈ مارک فیلڈ کانفرنس سینٹر، رتبی لین، مارک فیلڈ لی سسٹر شائر، برطانیہ، قیمت ۱۸ ڈالر۔

۸- **انتخاب اقتباسات قرآن مجید**، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، دینیات فیکلٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، قیمت درج نہیں۔

۹- **صدائے دل جلد سوم**، مولانا عبداللہ کاپودروی، مجلس معارف کاپودرا، قیمت درج نہیں۔

۱۰- **کشت دل**، بسمل اعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸ وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، نئی دہلی ۶، قیمت ۲۰۰ روپے۔